ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے

قیمت سالانہ چھ روپے

خالی صفحه

فہرست مضامین

جلد ۲۶	محرم وصفر ۱۳۶۴ھ مطابق جنوری و فروری ۱۹۴۵ء	عدد ۱، ۲

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اشاعت گذشتہ میں ہم بعض ان اوصاف و اعمال کا ذکر کر چکے ہیں جن کو قرآن مجید میں مذموم ٹھیرایا گیا ہے اور جن سے افراد اور جماعت کا تزکیہ مقصود ہے۔ اب اسی سلسلہ میں چند مزید اوصاف و اعمال کا ہم ذکر کرتے ہیں:

۵۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ کفران نعمت، ناشکری، احسان فراموشی و نمک حرامی قرار دیتا ہے:

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (الملک ۔ ۲۳)

اے نبی ان سے کہو کہ اللہ نے تم کو وجود بخشا، تمھیں کان، آنکھیں اور دل دیے مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو (یعنی نہ خود حقیقت پر غور کرتے ہو نہ آنکھیں کھول کر آیات الٰہی کو دیکھتے ہو نہ کسی کی نصیحت سنتے ہو)

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ڮ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (الفرقان ۔ ۵۰)

ہم آسمان سے برسنے والے پانی کو ان کے درمیان گردش دیتے ہیں تاکہ وہ (اس انتظام کو دیکھ کر) متنبہ ہوں اور سبق حاصل کریں مگر اکثر انسانوں نے ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کیا (یعنی بارش کا انتظام جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کی طرف ذرا توجہ نہ کی اور امرِ حق تک پہنچنے کے جو مواقع اللہ بار بار سامنے لاتا رہا ان سب کو کھوتے ہی چلے گئے)

مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (یوسف ۔ ۳۸)

(یوسف نے کہا) ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں۔ ہم پر اور سارے انسانوں پر اللہ کا احسان ہے (کہ اس نے اپنے سوا کسی کی بندگی کی ہمیں تکلیف نہیں دی) مگر اکثر انسان شکر ادا نہیں کرتے (یعنی بندگی غیر کی تکلیف میں خود اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں)

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ، وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَـيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (النحل ۔ ۷۳)

اللہ نے تمھارے لیے خود تمھاری اپنی جنس سے بیویاں پیدا کیں اور ان بیویوں سے تم کو بیٹے پوتے دیے اور تمھیں اچھی اچھی چیزیں رزق میں دیں، پھر کیا یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی بندگی کرتے ہیں جو نہ تو آسمانوں سے رزق دینے پر قادر ہیں نہ زمین سے اور جن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ... وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءًۢ بِقَدَرٍ ... وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ

جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے پیدا کیے ...... جس نے آسمان سے ایک اندازے پر پانی اتارا ...... جس نے تمام اقسام کی چیزیں پیدا کیں اور تمھارے لیے کشتیوں اور جانوروں کی صورت

اور ناشکروں کو ان کی ناشکری اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کہ ان کے رب کے ہاں انھیں اور زیادہ مغضوب بنا دے اور زیادہ خسارے میں مبتلا کر دے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ..... وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (الشوریٰ ۳)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی نے اللہ پر جھوٹ افترا کیا ہے؟ تو اے محمد اگر اللہ چاہے تو تمھارے قلب پر روشنی کا دروازہ بند کر دے اور باطل کو مٹا کر حق کو اپنے براہ راست احکام سے حق کر دکھائے۔ وہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے اور وہی (مہربان خدا) ہے جو بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور برائیوں سے درگذر کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو .... اور جو لوگ اس کی اس نعمت کا (جو اس نے ان کے لیے نبی بھیج کر اور اصلاح کا موقع دے کر انھیں عطا کی ہے) کفران کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (یونس-۶)

اے نبی ان سے کہو تم لوگوں نے کبھی اس معاملہ پر بھی غور کیا کہ جو رزق اللہ نے تمھارے لیے نازل کیا تھا اس میں تم نے باختیار خود کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام ٹھیرا لیا؟ ان سے پوچھو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کرتے ہو (یعنی یہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہو کہ خالق نے اس معاملہ میں ہمیں خود مختار کر دیا ہے یا یہ کہتے ہو کہ خدا ہی نے فلاں فلاں چیزیں حرام کی ہیں حالانکہ اس نے نہیں کیں)۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں وہ آخر کیا گمان کرتے ہیں کہ اللہ قیامت کے روز ان سے کیا سلوک کرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر فضل فرماتا ہے مگر لوگ شکرگذار نہیں ہوتے۔ (یعنی اللہ کا یہ فضل ہے کہ اس نے انسانی فطرت اور حقائق اشیا کے علم کی بنا پر خود انھیں بتا دیا کہ کیا حرام ہے اور کیا حلال مگر لوگ اس کی ناشکری کرتے ہیں اور خود اپنے قانون ساز بن بیٹھتے ہیں یا خدا کے قانون کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے مبنی بر قیاس و گمان قوانین کی پیروی کرتے ہیں)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (یٰس-۳)

اور جب ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے تم کو رزق دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو تو ناشکرے لوگوں نے اہل ایمان کو جواب دیا کیا ہم اس کو کھلائیں جسے اللہ چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا؟ تم لوگ تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔

۷- وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ خیانت سے تعبیر فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (انفال-۳)

اے ایمان لانے والو! جان بوجھ کر اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو (یعنی وفاداری و اطاعت کا عہد کرنے کے بعد اس کے پورا کرنے سے جی نہ چراؤ) اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو (یعنی جو ذمہ داریاں تمھارے اعتماد پر تمھارے سپرد کی گئی ہوں ان کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرو)

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (انفال-۷)

اور اگر تم کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو (یعنی یہ خطرہ ہو کہ معاہدہ تو اس نے کر لیا ہے مگر وہ در پردہ دشمن ہے اور موقع پاتے ہی عہد توڑ کر حملہ کر دے گی) تو اس کے عہد کو علی الاعلان اس کی طرف پھینک دو، اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا (یعنی اللہ کو یہ پسند نہیں ہے کہ جب دوسرے کی طرف سے خیانت

انفسکم والانعام ما ترکبون .... وجعلوا له من عباده جزءا ان الانسان لکفور مبین (الزخرف - ۱)

[illegible] سواریاں بنائیں .... لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا حصہ دار بنا ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (الزمر - ۱)

جب انسان پر کوئی سختی آتی ہے تو وہ بڑی توجہ کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے پھر جب اللہ اس کو اپنی رحمت سے سرفراز کر دیتا ہے تو وہ اس برے وقت کو بھول جاتا ہے جس میں ابھی ابھی دعائیں مانگ رہا تھا اور اللہ کے بہت سے مد مقابل کھڑے کر لیتا ہے تاکہ یہ حرکت اسے راہ خدا سے بھٹکا دے (اے محمد) اس انسان سے کہدو کہ اپنی ناشکری کے مزے تھوڑے دن لوٹ لے، آخر کو یقیناً تجھے دوزخیوں میں شامل ہونا ہے۔

وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ (الشوری - ۵)

جب ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ پھول جاتا ہے اور جب ان کے اپنے کرتوتوں کی بدولت ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہی انسان منکر نعمت ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ .... وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (النحل - ۱۱)

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں کان آنکھیں اور دل دیئے کہ شاید تم شکرگزار بنو .... اور اللہ نے تمہیں رہنے کو گھر دیئے، جانوروں کی کھالوں کے خیمے بخشے جنہیں تم کوچ اور قیام میں ہلکا پاتے ہو، اور جانوروں کے صوف، اون اور بالوں سے تم کو پہننے اور برتنے کی چیزیں عطا کیں جو ایک وقت مقرر تک کام دیتی ہیں، اور اس نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے تمہارے لیے سایہ کیا اور پہاڑوں میں پناہ گاہیں تم کو بخشیں اور وہ پوشاکیں تم کو عطا کیں جو تمہیں گرمی اور لڑائی میں بچاتی ہیں، اس طرح اللہ نے اپنا احسان تم پر مکمل کیا کہ شاید تم فرمانبرداری کرو ــــ اب اگر یہ لوگ اطاعت سے منہ موڑتے ہیں تو اے نبی تم پر صرف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، یہ لوگ اللہ کی نعمت کو جانتے ہیں پھر اس کا احسان ماننے سے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طرح کی مثالیں بار بار پیش کیں مگر اکثر انسان ناشکری ہی کرنے پر اڑے رہے (یعنی انہوں نے کتاب الٰہی کی ہدایت بخشی سے فائدہ نہ اٹھایا۔)

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (فاطر - ۵)

اس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، پھر جو کفران نعمت کرتا ہے (یعنی نعمت خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد بندگان خدا کا خدا بن بیٹھتا ہے یا خود مختار بن جاتا ہے یا بندوں کی بندگی کرنے لگتا ہے) تو اس کی اس ناشکری کا وبال اسی پر ہے

کا اندیشہ ہو تو اس سے پہلے تم ہی خیانت میں پیش قدمی کر جاؤ بلکہ راست بازی یہ ہے کہ اس کو صاف صاف مطلع کر دو کہ اب ہمارا تم سے کوئی معاہدہ نہیں ہے)

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (یوسف - ۷)

(یوسف نے کہا) یہ میں نے اس لیے کیا کہ اسے (عزیز مصر کو) معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے ساتھ خیانت نہیں کی (یعنی اس کے اعتماد سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا) اور یہ بھی وہ جان لے کہ اللہ خائنوں کی چال بازیوں کو کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا (یعنی عزیز کی بیوی نے اپنے شوہر کے ساتھ خیانت کر کے جو چال بازی کی تھی ان کی ناکامی سے وہ عبرت حاصل کرے)

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۚ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۭ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا (النساء - ۱۶)

اور ان لوگوں کی طرف سے نہ جھگڑو جو اپنے نفس سے آپ خیانت کرتے ہیں (یعنی مجرموں کو اپنے دل میں مجرم جاننے کے باوجود ان کی حمایت کرتے ہیں) یقیناً اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کار و معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے تو اپنی خیانت چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ خدا تو اس وقت بھی ان کے پاس ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی مرضی کے خلاف راتوں کو چھپ کر باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس پر محیط ہے۔ ہاں تم لوگوں نے دنیا کی زندگی میں تو مجرموں کی حمایت کر لی مگر قیامت کے روز اللہ کے مقابلہ میں کون ان کی حمایت لے گا یا کون ان کا وکیل بنے گا۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (بقرہ - ۲۳)

اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کر رہے تھے (یعنی ایک کام کو اپنے دل میں خود ناجائز سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب کر رہے تھے)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا (تحریم - ۲)

اللہ کافروں کی عبرت کے لیے مثال دیتا ہے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی۔ یہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کی بیویاں تھیں مگر انھوں نے ان کے ساتھ خیانت کی (یعنی بظاہر اپنے شوہروں کی وفاداری رہیں لیکن درپردہ اپنی گمراہ قوم کے ساتھی رہیں)

۷۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ شیطان کی رہنمائی کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰـىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (المجادلہ - ۳)

ان پر شیطان حاوی ہو گیا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کی پارٹی ہیں۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (النساء - ۱۸)

اور شیطان نے اللہ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔ میں انھیں بہکاؤں گا، میں انھیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا، میں انھیں حکم دوں گا اور وہ جانوروں کے کان پھاڑیں گے (یعنی جاہلانہ توہمات میں مبتلا ہوں گے اور مشرکانہ رسموں کی پابندی کریں گے) اور میں انھیں حکم دوں گا اور وہ خدا کی ساخت میں رد و بدل کریں گے (یعنی فطرت کے خلاف کام کریں گے اور خدا نے اشیا اور قوتوں کو جن اغراض کے لیے پیدا کیا ہے ان کے خلاف دوسری اغراض کے لیے انھیں استعمال کریں گے) اور جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا سرپرست بنایا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ-۲۱)

لوگو کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال اور پاک، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو (یعنی نہ تو خدا کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو حلال کرلو اور نہ اس کی حلال ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دے لو، نہ کسی کے جائز ذرائع کو ناجائز بناؤ اور نہ ناجائز ذرائع کو جائز بنالو) شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے، وہ تمھیں بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات پر اکساتا ہے کہ اللہ کا نام لیکر وہ باتیں کہو جو تمھیں معلوم نہیں ہے کہ واقعی اللہ ہی کی فرمائی ہوئی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ-۲۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ (یعنی اپنی پوری زندگی کو دائرہ اسلام میں لے آؤ) اور شیطان کے پیچھے نہ چلو (یعنی ایسا نہ کرو کہ اپنی زندگی کا کچھ حصہ اسلام کے اندر رکھو اور باقی حصوں کو اس سے باہر رکھ کر شیطان کی پیروی کرنے لگو) شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران-۱۸)

وہ تو شیطان ہے جو تمھیں اپنے دوستوں (یعنی دشمنان حق) سے ڈراتا ہے پس تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ...... اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا (بقرہ-۳۷)

جو اچھے مال تم نے کمائے ہیں اور جو عمدہ چیزیں ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں ان میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو اور ایسا نہ کرو کہ بری سے بری چیز چھانٹ کر خدا کی راہ میں دینے لگو ...... شیطان تمھیں فقر کا خوف دلاتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ خدا کی راہ میں فیاضی دکھاؤ گے تو تنگ دست ہو جاؤ گے) اور بے شرمی (یعنی بخل اور تنگ دلی) کا حکم دیتا ہے، مگر اللہ تم کو اپنی بخشش اور اپنے فضل کی امید دلاتا ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (اعراف-۲۴)

نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو اور اگر شیطان تمھیں اکسائے (یعنی جاہلوں سے جھگڑنے اور بحثیں کرنے اور نفسانیت کی لڑائی لڑنے پر آمادہ کرے) تو اللہ کی پناہ مانگو۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل-۳)

اور فضول خرچی نہ کر (یعنی خدا کے دیے ہوئے مال کو اپنی نفس پرستی اور ناجائز کاموں اور خلاف حق کوششوں میں نہ اڑاؤ) فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (المجادلہ)

خفیہ سرگوشی شیطان کی تحریک سے ہوتی ہے تاکہ اہل ایمان کو رنجیدہ کرے۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ... اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (المائدہ-۱۲)

یہ شراب اور جوا اور آستانے (جن پر غیر اللہ کے لیے قربانیاں چڑھائی جاتی اور منتیں مانی جاتی ہیں)، اور پانسے (جن سے فالیں لی جاتی ہیں اور قسمیں دریافت کی جاتی ہیں) وہ گندگیاں ہیں جو شیطان نے تیار کی ہیں لہٰذا ان سے بچو، امید ہے کہ فلاح پاؤگے۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے درمیان عداوتیں اور کینے ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے۔

لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ

شیطان تمھیں اسی طرح فتنہ میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمھارے والدین

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (احقاف - ۱)

اور اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اس کی دعا کا جواب نہیں دے سکتے بلکہ جنہیں اس کی دعا کی سرے سے خبر ہی نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (النساء - ۲۰)

اور جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کو نہ مانے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (بقرہ - ۱۳)

اور جو ایمان کو کفر سے بدلے (یعنی ایمان لانے کے بعد کافرانہ رویہ اختیار کرے) اس نے سیدھی راہ گم کر دی۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الزمر - ۳)

تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کے ذکر سے (نرم پڑنے اور پگھلنے کے بجائے الٹے) سخت ہو جائیں، ایسے لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (الحجر)

اور اللہ کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون مایوس ہوتا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (الشوریٰ ۲)

خبردار جو لوگ قیامت کے معاملہ میں بحثیں کرتے ہیں (یعنی نہ صرف یہ کہ خود نہیں مانتے بلکہ دوسروں کو بھی انکار یا شک میں مبتلا کرنے کے لیے حجت بازیاں کرتے ہیں) وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (ابراہیم - ۱)

جو لوگ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ (راہ راست ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھی ہو جائے وہ گمراہی میں دور نکل گئے ہیں۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص - ۵)

اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدا سے ہدایت لیے بغیر اپنی خواہشات کے پیچھے چل رہا ہو۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (آل عمران)

پھر جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنہ کی تلاش میں کتاب الٰہی کی ان آیات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ...... وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (الممتحنہ - ۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو میرے دشمن اور اپنے دشمن (یعنی خدا اور اہل ایمان کے دشمن) کو دوست نہ بناؤ .... اور جس نے تم میں سے ایسا کیا اس نے راہ راست گم کر دی۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (احزاب - ۵)

اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا

نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی و جہالت کی بنا پر

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (اعراف ۳) (آدم وحوا) کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس اتروا دیے تھے تاکہ انھیں ایک دوسرے کو برہنہ دکھائے۔

۸۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ (النحل ۳) اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو استکبار کرتے ہیں (یعنی اپنی خود پرستی کے گھمنڈ میں خدا کے آگے جھکنے اور اس کی آیات پر توجہ کرنے اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے سے منہ موڑتے ہیں یا بالفاظ دیگر بندے ہو کر اپنے رب کے سامنے اکڑتے ہیں)

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ (الشوریٰ ۴) وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (بقرہ ۲۴) اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (یعنی ان لوگوں کو جو اپنے جائز حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں)

لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبٰتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (المائدہ ۱۲) اللہ نے جو پاک چیزیں حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کر لو اور زیادتی نہ کرو (یعنی خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو) اللہ کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (المائدہ ۹) اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (قصص ۸) اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا (یعنی جو اپنی خوشحالی پر پھولے ہوں اور دنیوی عیش میں مگن ہو کر خدا اور آخرت سے بے نیاز بن جاتے ہوں)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ (النساء ۶) اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں متکبر ہوں اور دوسروں پر فخر جتائیں، جو خود بھی بخل کریں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کریں اور جو فضل اللہ نے انھیں عطا کیا ہو اسے چھپائیں۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمان ۲) اور لوگوں سے منہ پھیر کر (یعنی متکبرانہ شان کے ساتھ) بات نہ کر اور نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں بڑا بنتا ہو اور دوسروں پر فخر جتائے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا (نساء ۱۶) اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کار و معصیت پیشہ ہو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ (حج ۵) اللہ کسی خائن اور ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ (نساء ۲۱) اللہ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ بدگوئی میں زبان کھولی جائے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

۹۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ کج روی و گمراہی قرار دیتا ہے:

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيدًا (النساء ۱۸) اور جو اللہ کے ساتھ (خدائی و معبودیت میں) کسی کو شریک کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (انعام-۱۴۰)

ہلاک کیا اور جو رزق اللہ نے انھیں دیا تھا اسے اللہ پر افترا باندھتے ہوئے (یعنی یہ کہہ کر کہ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے) اپنے اوپر حرام کر لیا، یہ لوگ بہک گئے تھے اور ہرگز راہ راست پائے ہوئے نہ تھے۔

۱۰۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ مانع فلاح اور موجب خسران قرار دیتا ہے:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللّٰهِ أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (عنکبوت ۶)

جن لوگوں نے باطل کو مانا اور اللہ کو نہ مانا وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

قُلْ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجٰهِلُونَ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ (الزمر ۷)

اے نبی ان سے کہو نادانو! کیا تم مجھے یہ تلقین کرتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کروں؟ حالانکہ تمھاری طرف اور تم سے پہلے تمام پیغمبروں کی طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا سب کیا کرایا ضائع ہو جائے گا اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُونِهِ قُلْ إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (الزمر ۲)

اے نبی ان سے کہو کہ میں تو اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اسی کی بندگی کروں گا۔ تم اسے چھوڑ کر جس جس کی چاہو بندگی کرتے رہو۔ ان سے کہو اصلی خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو قیامت کے روز خسارے میں ڈالا۔ خبردار! یہی صریح ناکامی و نامرادی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (یونس-۷)

وہ کہتے ہیں کہ خدا نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے۔ وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں سب کچھ اسی کا ہے۔ تمھارے پاس اس قول کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کیا تم اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہو جنھیں تم جانتے نہیں ہو؟ اے نبی ان سے کہو کہ جو لوگ اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں وہ فلاح نہیں پا سکتے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلَى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَى وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (الحج-۲)

لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو تذبذب کے ساتھ خدا کی بندگی کرتا ہے اگر اس بندگی میں کچھ اس کا بھلا ہو گیا تو مطمئن رہا اور اگر کسی تکلیف و مصیبت کا سابقہ پیش آگیا تو الٹا پھر گیا۔ ایسا شخص دنیا و آخرت دونوں میں خسارے میں رہا اور یہی صریح ناکامی ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ (آل عمران-۹)

اور جو شخص اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کوئی دوسرا طریق زندگی اختیار کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ إِنَّ

اور یہ کہو وہ باتیں جو تمھاری زبانیں جھوٹ گھڑا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔ ایسا کہنے سے تم اللہ پر جھوٹ افترا کرنے کے مرتکب ہوتے ہو (یعنی خود تمھارا

تفہیم القرآن

(۱۹)

الانفال

(رکوع ۵ تا ختم سورہ)

اے نبی! ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گذشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔[۳۱] پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے، اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔[۳۲]

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔[۳۳] اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن، ہم نے اپنے

---

[۳۱] یہاں پھر مسلمانوں کی جنگ کے اسی ایک مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے سورہ بقرہ (رکوع ۲۴) میں بیان کیا گیا تھا۔ اس مقصد کا سلبی جزء یہ ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور ایجابی جزء یہ کہ دین بالکل اللہ کے لیے ہو جائے۔ بس یہی ایک اخلاقی مقصد ایسا ہے جس کے لیے لڑنا اہل ایمان کے لیے جائز بلکہ فرض ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے مقصد کی لڑائی جائز نہیں ہے اور نہ اہل ایمان کو زیبا ہے کہ اس میں کسی طرح حصہ لیں۔

اس مقصد کے دونوں سلبی و ایجابی اجزاء کی تشریح ہم سورۂ بقرہ کے حواشی میں کر چکے ہیں۔

[۳۲] اس کی تشریح بھی سورۂ بقرہ، رکوع ۲۴ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔

[۳۳] یہاں اس مال غنیمت کی تقسیم کا قانون بتایا گیا ہے جس کے متعلق تقریر کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ یہ اللہ کا انعام ہے جس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول ہی کو حاصل ہے۔ اس آیت میں اس کا یہ ضابطہ مقرر کیا گیا ہے کہ لڑائی کے بعد تمام سپاہی ہر طرح کا مال غنیمت لا کر امیر یا امام کے سامنے رکھ دیں اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھیں۔ پھر اس مال میں سے پانچواں حصہ ان اغراض کے لیے نکال لیا جائے جو آیت میں بیان ہوئی ہیں، اور باقی چار حصے ان سب لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا ہو۔ چنانچہ اس آیت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لڑائی کے بعد اعلان فرمایا کرتے تھے کہ ان ھذہ غنائمکم وانہ لیس لی فیھا الا نصیبی معکم الخمس والخمس مردود علیکم فادوا الخیط والمخیط واکبر من ذلک واصغر ولا تغلوا فان الغلول عار ونار (یہ غنائم تمہارے ہی لیے ہیں، میری اپنی ذات کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہے بجز خمس کے اور وہ خمس بھی تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر صرف کر دیا جاتا ہے، لہٰذا ایک ایک سوئی اور ایک ایک تاگا تک لا کر رکھ دو، کوئی چھوٹی یا (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

بندے پر نازل کی تھی [1] اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اِس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلو تہی کر جاتے، لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لیے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے، [2] یقیناً خدا سننے اور جاننے والا ہے [3]

اور یاد کرو وہ وقت جبکہ خدا ان کو پیغمبر کے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا [4] اگر کہیں وہ انہیں زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے، لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱) بڑی چیز چھپا کر نہ رکھو کہ ایسا کرنا شرمناک ہے اور اس کا نتیجہ دوزخ ہے)

اس تقسیم میں اللہ اور رسول کا حصہ ایک ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ خمس کا ایک جزء اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین حق کے کام میں صرف کیا جائے۔

رشتہ داروں سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضورؐ ہی کے رشتہ دار تھے کیونکہ جب آپ اپنا سارا وقت دین کے کام میں صرف فرماتے تھے، و اپنی معاش کیلیے کوئی کام کرنا آپکے لیے ممکن نہ رہا تھا تو لامحالہ اس کا انتظام ہونا چاہیے تھا کہ آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی اور ان دوسرے اقربا کی جن کی کفالت آپکے ذمہ تھی، ضروریات پوری ہوں۔ اس لیے خمس میں آپکے اقربا کا حصہ رکھا گیا۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد ذوی القربیٰ کا یہ حصہ کس کو پہنچتا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حصہ منسوخ ہو گیا۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ حضورؐ کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضورؐ کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصہ خاندان نبوت کے فقراء میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسی تیسری رائے پر عمل ہوتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی وہ تائید و نصرت جس کی بدولت تمہیں فتح حاصل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ تمہیں فتح اسی کی تائید سے حاصل ہوئی ہے تو غنیمت کی تقسیم کے اس ضابطہ کو بے چون و چرا قبول کر لو۔ اس بات پر زور دینے کے لیے بعد کی آیات میں پھر چند واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (جس طرح سورہ کی ابتدا میں کیا گیا تھا) جن سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ یہ فتح بالکل تمہاری اپنی جانفشانی کا نتیجہ اور یہ مال غنیمت سراسر تمہاری اپنی محنت کا ثمرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں غالب حصہ اللہ کی مدد کا ہے، لہٰذا یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ وہ صرف پانچواں حصہ اپنے کام کے لیے لے رہا ہے اور چار حصے تمہارے لیے چھوڑے دیتا ہے ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پانچواں حصہ تمہارے لیے چھوڑا جاتا اور چار حصے خدا اپنے کام کے لیے رکھ لیتا۔

[2] یعنی ثابت ہو جائے کہ جو زندہ رہا اسے زندہ ہی رہنا چاہیے تھا اور جو ہلاک ہوا اسے ہلاک ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں زندہ رہنے والے اور ہلاک ہونے والے سے مراد افراد نہیں ہیں بلکہ اسلام اور جاہلیت ہیں۔

[3] یعنی خدا اندھا، بہرا، بے خبر خدا نہیں ہے بلکہ دانا و بینا ہے۔ اس کی خدائی میں اندھا دھند کام نہیں ہو رہا ہے۔

[4] یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر مدینہ سے نکل رہے تھے یا راستہ میں کسی منزل پر تھے اور یہ محقق نہ ہوا تھا کہ کفار کا لشکر فی الواقع کتنا ہے۔ اس وقت حضورؐ نے خواب میں اس لشکر کو دیکھا اور جو منظر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ دشمنوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔

۱ اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی آنکھوں میں تمھیں کم کرکے پیش کیا، تاکہ جو بات ہونی تھی اسے اللہ ظہور میں لے آئے، اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو،[1] یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں،[2] جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

---

[1] یعنی اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھو، جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو، ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو، خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمھارے قدموں میں لغزش نہ آئے، اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرانے پائے، مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آ رہے ہوں تو اضطراب میں تمھارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں، حصول مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمھارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں، اور دنیوی فوائد و منافع اور لذاتِ نفس کی ترغیبات تمھیں اپنی طرف لبھا رہی ہوں تو ان کے مقابلہ میں بھی تمھارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔ یہ تمام مفہومات صرف ایک لفظ "صبر" میں پوشیدہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام حیثیات سے صابر ہوں میری تائید انھی کو حاصل ہوتی ہے۔

[2] اشارہ ہے کفار قریش کی طرف، جن کا لشکر مکہ سے اس شان سے نکلا تھا کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں، جگہ جگہ رقص و سرود اور شراب نوشی کی محفلیں برپا ہوتی تھیں، جو جو قبیلے اور قریے راستہ میں ملتے تھے ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرت تعداد اور اپنے سروسامان کا رعب جمایا جاتا تھا اور ڈینگیں ماری جاتی تھیں کہ بھلا ہمارے مقابلہ میں کون سر اٹھا سکتا ہے۔ یہ تو تھی ان کی اخلاقی حالت، اور اس پر مزید لعنت یہ تھی کہ ان کے نکلنے کا مقصد ان کے اخلاق سے بھی زیادہ ناپاک تھا۔ وہ اس لیے جان و مال کی بازی لگانے نہیں نکلے تھے کہ حق اور راستی اور انصاف کا علم بلند ہو بلکہ اس لیے نکلے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے اور وہ اکیلا گروہ بھی جو دنیا میں اس مقصد حق کے لیے اٹھا ہے ختم کر دیا جائے تاکہ اس علم کو اٹھانے والا دنیا بھر میں کوئی نہ رہے۔ اس پر مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم کہیں ایسے نہ بن جانا۔ تمھیں اللہ نے ایمان اور حق پرستی کی جو نعمت عطا کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمھارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں، اور تمھارا مقصد جنگ بھی پاک ہو۔

یہ ہدایت اسی زمانہ کے لیے نہ تھی، آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ کفار کی فوجوں کا جو حال اس وقت تھا وہی آج بھی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈے اور شراب کے پیپے ان کے ساتھ جزو لاینفک کی طرح لگے رہتے ہیں، خفیہ طور پر نہیں بلکہ علی الاعلان نہایت بے شرمی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ راشن مانگتے ہیں اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی شہوات کا کھلونا بننے کے لیے پیش کرے، پھر بھلا کوئی دوسری قوم ان سے کیا امید کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کی سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھیں گے۔ رہا ان کا تکبر اور تفاخر تو ان کے ہر سپاہی اور ہر افسر کی چال ڈھال اور انداز گفتگو میں نمایاں دیکھا جا سکتا ہے، اور ان میں سے ہر قوم کے مدبرین کی تقریروں میں لا غالب لکم الیوم اور من اشد منا قوۃ کی ڈینگیں سنی جا سکتی ہیں۔ ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصد جنگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت مکاری کے ساتھ دنیا کو یقین دلاتا ہے کہ اس کے پیش نظر انسانیت کی فلاح ہے مگر کسی کی لڑائی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے اس پر تنہا اسی کی قوم متصرف ہو (باقی صفحہ [illegible] پر)

۴۸ ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر
غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمھارا ساتھ نہیں ہے،
میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے ع۶
دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے۔[41] حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا
زبردست اور دانا ہے۔ کاش تم اُس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے! وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر
ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمھارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر
ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔ یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آلِ فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ
انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ اللہ کسی
نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔[42] اللہ سب کچھ سننے اور
جاننے والا ہے۔ آلِ فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا کہ انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب
ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں ہلاک کیا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا، یہ سب ظالم لوگ تھے۔
یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر کسی طرح اس کے قبول
کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔[43]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) اور دوسرے اس کے چاکر اور دست نگر بن کر رہیں۔ پس اہلِ ایمان کو قرآن کی یہ دائمی ہدایت ہے کہ ان فساق و فجار کے طور طریقوں سے بھی بچیں اور اُن
ناپاک مقاصد میں بھی اپنی جان و مال کھپانے سے پرہیز کریں جن کے لیے یہ لوگ لڑتے ہیں۔
(حواشی صفحہ ہٰذا) [41] یعنی مدینہ کے منافقین اور وہ سب لوگ جو دنیا پرستی اور خدا سے غفلت کے مرض میں گرفتار تھے، یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت
قریش جیسی زبردست طاقت سے ٹکرانے کے لیے جا رہی ہے، آپس میں کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دینی جوش میں دیوانے ہو گئے ہیں، اس معرکہ میں ان کی تباہی یقینی ہے،
مگر اس نبی نے کچھ ایسا افسوں ان پر پھونکا ہے کہ ان کی عقل خبط ہو گئی ہے اور آنکھوں دیکھتے یہ موت کے منہ میں چلے جا رہے ہیں۔
[42] یعنی جب تک کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں بنا دیتی اللہ اس سے اپنی نعمت سلب نہیں کیا کرتا۔
[43] یہاں خاص طور پر اشارہ ہے یہود کی طرف۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے انہی کے ساتھ حسنِ جوار اور باہمی تعاون
و مددگاری کا معاہدہ کیا تھا اور اپنی حد تک پوری کوشش کی تھی کہ ان سے خوشگوار تعلقات قائم رہیں، نیز دینی حیثیت سے بھی آپ یہود کو مشرکین کی بہ نسبت اپنے
قریب تر سمجھتے تھے اور ہر معاملہ میں مشرکین کے بالمقابل اہلِ کتاب ہی کے طریقہ کو ترجیح دیتے تھے، لیکن ان کے علماء اور مشائخ کو توحیدِ خالص اور اخلاقِ
صالحہ کی وہ تبلیغ اور اعتقادی و عملی گمراہیوں پر وہ تنقید اور اقامتِ دینِ حق کی وہ سعی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، ایک آن نہ بھاتی تھی اور ان کی
پیہم کوشش یہ تھی کہ یہ نئی تحریک کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔ اسی مقصد کے لیے وہ مدینہ کے منافق مسلمانوں سے ساز باز کرتے تھے، اسی کے لیے اوس
اور خزرج کے لوگوں میں وہ ان پرانے اختلافات کو بھڑکاتے تھے جو اسلام سے پہلے ان کے درمیان کشت و خون کے موجب بنتے رہے تھے، اسی کے لیے
قریش اور دوسرے مخالفِ اسلام قبیلوں سے ان کی خفیہ سازشیں چل رہی تھیں، اور یہ سب حرکات اس معاہدۂ دوستی کے باوجود (باقی صفحہ ۱۵ پر)

پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دوسرے لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے۔ اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔[۴۳] یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرینِ حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے، یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔ ع ۷

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) ہو رہی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان لکھا جا چکا تھا جب جنگ بدر واقع ہوئی تو ابتدا میں ان کو توقع تھی کہ قریش کی پہلی ہی چوٹ اس تحریک کا خاتمہ کر دے گی۔ لیکن جب نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تو ان کے سینوں کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اٹھی اور اس اندیشہ سے کہ بدر کی فتح کہیں اسلام کی طاقت کو ایک مستقل "خطرہ" نہ بنا دے انھوں نے اپنی مخالفانہ کوششوں کو تیز تر کر دیا، حتی کہ ان کا ایک لیڈر کعب بن اشرف (جو قریش کی شکست سنتے ہی چیخ اٹھا تھا کہ آج زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے) خود مکہ گیا اور وہاں اس نے ہیجان انگیز مرثیے کہہ کہہ کر قریش کو انتقام کا جوش دلایا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے بس نہ کی، یہودیوں کے قبیلۂ بنی قَیْنُقَاع نے معاہدۂ حسن جوار کے خلاف ان مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا جو ان کی بستی میں کسی کام سے جاتی تھیں۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حرکت پر متنبہ کیا تو انھوں نے جواب میں دھمکی دی کہ "یہ قریش نہ باشد، ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں اور لڑنا جانتے ہیں، ہمارے مقابلہ میں آؤ گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۴۳] یہاں معاہدات کے متعلق ایک مستقل اخلاقی قانون بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کی رو سے ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ بد عہدی کر رہی ہے، یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گی تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریقِ ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا، تاکہ فسخِ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدۃ حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء (جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے)۔ پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ لا تخن من خانک (جو تیری خیانت کرے تو اس کی خیانت نہ کر) اور یہ اصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہ نے اپنے عہدِ بادشاہی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکایک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے، تو ان کی اس کارروائی پر عمرو بن عَنْبَسہؓ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سنا کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماعِ فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملہ سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو[۵۱] تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

اور اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔[۵۲] وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی[۵۳] اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے،[۵۴] یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ اور اے نبی تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔ ع ۸

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھا لیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کے ساقط کرنے کے لیے جائز ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے ان بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جبکہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۱] اس سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج (**Standing Army**) ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ و سامان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔

[۵۲] یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہ ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسہ پر بہادرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہر حال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خونریزی کو طول کیوں دو۔ اور اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

[۵۳] خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور فرمایا جا رہا ہے کہ جس خدا نے دو سال کے اندر اندر تمہاری بیچارگی کو ختم کر کے آج اتنی طاقت تمہیں بہم پہنچا دی ہے اسی سے توقع رکھو کہ آئندہ اگر کوئی تمہارے ساتھ غداری کرے گا تو وہ اس کے مقابلہ کی طاقت بھی تمہیں بہم پہنچا دے گا۔

[۵۴] اشارہ ہے اس بھائی چارے اور الفت و محبت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہل عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جتھا بنا دیا تھا، حالانکہ اس جتھے کے افراد ان مختلف قبیلوں سے نکلے ہوئے تھے جن کے درمیان صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا یہ فضل اوس و خزرج کے معاملہ میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اور مشہور جنگ بعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے جس میں اوس نے خزرج کو اور خزرج نے اوس کو گویا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو تین سال کے اندر گہری دوستی و برادری میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزا کو جوڑ کر ایسی ایک بنیان مرصوص بنا دینا جیسی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی جماعت تھی، یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا اور دنیوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تائید و نصرت نے یہ کچھ کر دکھایا ہے تو آئندہ بھی تمہاری نظر دنیوی اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تائید پر ہونی چاہیے کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا۔

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرینِ حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔[51] اچھا، اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے،[52] اور اللہ صابروں ہی کا ساتھ دیتا ہے۔

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے، اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔[53] یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع۹

---

[51] جسے آج کل کی اصطلاح میں قوتِ معنوی یا قوتِ اخلاقی (Morale) کہتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ نے فقہ، فہم اور سمجھ بوجھ (Understanding) سے تعبیر کیا ہے، اور یہ لفظ اس مفہوم کے لیے زیادہ سائنٹفک ہے۔ جو شخص اپنے مقصد کا صحیح شعور رکھتا ہو اور ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر اس لیے لڑ رہا ہو کہ جس چیز کے لیے وہ جان کی بازی لگانے آیا ہے وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے، وہ بے شعوری کے ساتھ لڑنے والے سے کئی گنی زیادہ طاقت رکھتا ہے اگرچہ جسمانی طاقت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ پھر جس شخص کو حقیقت کا شعور حاصل ہو، جو اپنی ہستی اور خدا کی ہستی، اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق اور حیاتِ دنیا کی حقیقت اور موت کی حقیقت اور حیات بعد موت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو اور جسے حق اور باطل کے فرق اور غلبۂ باطل کے نتائج کا بھی صحیح ادراک ہو، اس کی طاقت کو تو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیت یا وطنیت یا طبقاتی نزاع کا شعور لیے ہوئے میدان میں آئیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ ایک سمجھ بوجھ رکھنے والے مومن اور ایک کافر کے درمیان حقیقت کے شعور اور عدمِ شعور کی وجہ سے فطرۃً ایک اور دس کی نسبت ہے۔ لیکن یہ نسبت صرف سمجھ بوجھ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صبر کی صفت بھی ایک لازمی شرط ہے۔

[52] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب چونکہ تم میں کمزوری آگئی ہے اس لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی گئی ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہلِ ایمان اور کفار کے درمیان ایک اور دس کی نسبت ہے لیکن چونکہ ابھی تم لوگوں کی اخلاقی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک تمہارا شعور اور تمہاری سمجھ بوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہنچا ہے اس لیے سردست بر سبیلِ تنزل تم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرانے میں تو تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ یہ خیال رہے کہ یہ ارشاد ۲ھ کا ہے جبکہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ ہی داخلِ اسلام ہوئے تھے اور ان کی تربیت ابتدائی حالت میں تھی۔ بعد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں یہ لوگ پختگی کو پہنچ گئے تو فی الواقع ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت قائم ہو گئی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیوں میں بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے۔

[53] اس آیت کی تفسیر میں اہلِ تاویل نے جو روایات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ جنگِ بدر میں لشکرِ قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے تھے ان کے متعلق بعد میں مشورہ ہوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ قتل کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے قبول کی اور فدیہ کا معاملہ طے کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات بطورِ عتاب نازل فرمائیں۔ پھر اس فقرے کی یہ حضرات کوئی معقول تاویل نہیں کر سکے ہیں کہ "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا"۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد تقدیرِ الٰہی ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ ارادہ فرما چکا تھا کہ مسلمانوں کے لیے غنائم کو حلال کر دے گا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جب وحیِ تشریعی کے ذریعہ سے کسی چیز کی اجازت نہ دی گئی ہو، اس کا لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت پوری اسلامی جماعت (باقی صفحہ ۱۸ پر)

اے نبی! تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اُس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم ہے۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور مال کھپائے اور جنھوں نے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہی درحقیقت ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر جنھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں[51]۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو یہ مدد تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو[52]۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم (ایک دوسرے کی حمایت) نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد برپا ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) اس تاویل کی رُو سے گناہ گار قرار پاتی ہے جس کو محض اخبارِ آحاد کے اعتماد پر قبول کر لینا ایک بڑی ہی سخت بات کا التزام کرنا ہے۔

میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے سورۂ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی تھیں اُن میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا۔ اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے جو قیدی گرفتار کیے اور ان سے بعد میں جو فدیہ وصول کیا وہ تھا تو اجازت کے مطابق، مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کچل دینے کی جو شرط مقدم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا، حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے اور یہ عتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر ہے۔ فرمانِ مبارک کا منشا یہ ہے کہ "تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ نبی کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہِ راست تعلق رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب آجاتا ہے۔ پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا، پھر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے غنیمت لوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے، پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر تمہیں سخت سزا دیتے۔ خیر، جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھاؤ مگر آئندہ ایسی روش سے بچتے رہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔" میں اس رائے پر پہنچ چکا تھا کہ امام ابوبکر جصاص کی کتاب احکام القرآن میں یہ دیکھ کر مجھے مزید اطمینان حاصل ہوا کہ امام موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابلِ لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [51] جو لوگ اسلام قبول کرنے کے باوجود اپنی دنیوی مصلحتوں اور اپنے ضعفِ ایمانی کی وجہ سے مکہ میں رہ گئے تھے ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد جنگ کے موقع پر لشکرِ کفار میں شامل ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آئی تھی۔ چنانچہ ان میں سے حارث بن زمعہ، ابو قیس بن الفاکہ، ابو قیس بن ولید، علی بن امیہ بن خلف، عاص بن منبہ بن الحجاج وغیرہ چند لوگ میدانِ جنگ میں مارے بھی گئے۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق یہاں یہ اصولی بات طے کر دی گئی ہے کہ اہلِ ایمان ایسے مسلمانوں کو اپنا دوستی رفیق نہ سمجھیں جو دارالکفر کو چھوڑ کر قدرت کے باوجود ہجرت کرنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے دنیوی مصلحتوں کو اسلامی زندگی پر ترجیح دیں۔ اسی قرآنی فرمان کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا کہ انا بریٔ من کل مسلم بین ظہرانی المشرکین (میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہے) اور من جامع المشرک وسکن معہ فانہ مثلہ (جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور اسی کے ساتھ رہا بسا وہ اسی کی طرح ہے)۔ [52] یعنی اگر کسی علاقہ میں مسلمان کفار سے مغلوب ہوں اور کفار ان پر ظلم کر رہے ہوں (بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جدوجہد کی وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔[1] یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے! ع۱۰

التوبہ

(از رکوع ۱ تا رکوع ۵)

یہ سورہ دو ناموں سے مشہور ہے۔ ایک التوبہ دوسرے البراءۃ۔ توبہ اس لحاظ سے کہ اس میں ایک جگہ بعض اہل ایمان کے قصوروں کی معافی کا ذکر ہے۔ اور براءۃ اس لحاظ سے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بریٔ الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔

اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی جاتی۔ اس کے متعدد وجوہ مفسرین نے بیان کیے ہیں جن میں بہت کچھ اختلاف ہے، مگر صحیح بات وہی ہے جو امام رازی نے لکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی اس لیے صحابہ کرام نے بھی نہیں لکھی اور بعد کے لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جوں کا توں لینے اور جیسا دیا گیا تھا ویسا ہی اس کو محفوظ رکھنے میں کس درجہ احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے:

پہلی تقریر آغاز سورہ سے پانچویں رکوع کے آخر تک چلتی ہے۔ یہ ذی القعدہ ۹ھ یا اس کے قریب زمانہ میں نازل ہوئی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحاج مقرر کر کے مکہ روانہ کر چکے تھے۔ بعد میں جب یہ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فوراً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ حج کے موقع پر تمام عرب کے نمائندہ اجتماع میں اسے سنائیں اور اس کے مطابق جو طرزِ عمل تجویز کیا گیا تھا اس کا اعلان کر دیں۔

دوسری تقریر رکوع ۶ کی ابتداء سے رکوع ۹ کے اختتام تک چلتی ہے اور یہ رجب ۹ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ اس میں اہل ایمان کو جہاد پر اکسایا گیا ہے اور ان لوگوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جو نفاق یا ضعف ایمان یا سستی و کاہلی کی وجہ سے راہِ خدا میں جان و مال کا زیاں برداشت کرنے سے جی چرا رہے تھے۔

تیسری تقریر رکوع ۱۰ سے شروع ہو کر سورہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں متعدد ٹکڑے انھی ایام میں مختلف مواقع پر اترے ہیں اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو یکجا کر کے ایک سلسلۂ تقریر میں منسلک کر دیا ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلۂ واقعات سے متعلق ہیں اس لیے ربطِ تقریر میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا۔ اس میں منافقین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) اور دینِ اسلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے انھیں ستاتے ہوں اور وہ مغلوب مسلمان اسلامی حکومت سے مدد مانگیں تو اس کا فرض ہے کہ ان کی مدد کرے، لیکن ان کی مدد پر معاہدہ کا احترام بہرحال مرجح رہے گا، لہٰذا اگر وہ قوم جس کے خلاف ان مظلوم مسلمانوں نے مدد مانگی ہو، اسلامی حکومت کے ساتھ پہلے سے معاہدہ کر چکی ہو تو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ (حاشیہ صفحہ ہذا): [1] مراد یہ ہے کہ میراث اسلامی بھائی چارے کی بنا پر قائم نہ ہوگی، اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کے تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں، دینی بھائیوں کو ایک دوسرے کے معاملہ میں حاصل ہوں گے۔ ان امور میں اسلامی تعلق کے بجائے رشتہ داری کا تعلق ہی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔

کی حرکات پر تنبیہ، غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر زجر و توبیخ، اور ان صادق الایمان لوگوں پر ملامت کے ساتھ معافی کا اعلان جو اپنے ایمان میں سچے تو تھے مگر جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے سے باز رہے تھے۔

نزولی ترتیب کے لحاظ سے پہلی تقریر سب سے آخر میں آنی چاہیے تھی لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے وہی سب سے مقدم تھی اس لیے مصحف کی ترتیب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہلے رکھا اور بقیہ دونوں تقریروں کو موخر کر دیا۔

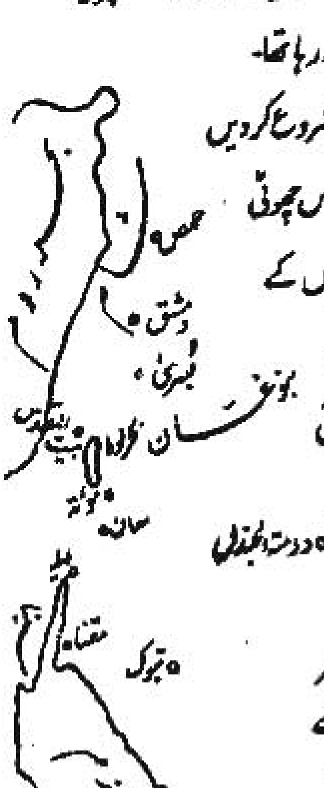
زمانۂ نزول کی تعیین کے بعد ہمیں اس سورہ کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ جس سلسلۂ واقعات سے اس کے مضامین کا تعلق ہے اس کی ابتدا صلح حدیبیہ سے ہوتی ہے۔ حدیبیہ تک چھ سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ اس شکل میں رونما ہو چکا تھا کہ عرب کے تقریباً ایک تہائی حصہ میں اسلام ایک منظم سوسائٹی کا دین، ایک مکمل تہذیب و تمدن اور ایک کامل با اختیار ریاست بن گیا تھا۔ حدیبیہ کی صلح جب واقع ہوئی تو اس دین کو یہ موقع بھی حاصل ہو گیا کہ اپنے اثرات نسبتاً زیادہ امن و اطمینان کے ماحول میں ہر چہار طرف پھیلا سکے۔ اس کے بعد واقعات کی رفتار نے دو بڑے راستے اختیار کیے جو آگے چل کر نہایت اہم نتائج پر منتہی ہوئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق عرب سے تھا اور دوسرے کا سلطنت روم سے۔

عرب میں حدیبیہ کے بعد دعوت و تبلیغ اور استحکام قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام کا دائرۂ اثر اتنا پھیل گیا اور اس کی طاقت اتنی زبردست ہو گئی کہ پرانی جاہلیت اس کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ آخر کار جب قریش کے زیادہ پرجوش عناصر نے بازی ہرتی دیکھی تو انھیں یارائے ضبط نہ رہا اور انھوں نے حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ ڈالا۔ وہ اس بندش سے آزاد ہو کر اسلام سے ایک آخری فیصلہ کن مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس عہد شکنی کے بعد ان کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا اور اچانک مکہ پر حملہ کر کے رمضان ۸ھ میں اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد قدیم جاہلی نظام نے آخری حرکت مذبوحی حنین کے میدان میں کی جہاں ہوازن، ثقیف، نضر، جشم اور بعض دوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت لا کر جھونک دی تاکہ اس اصلاحی انقلاب کو روکیں جو فتح مکہ کے بعد تکمیل کے مرحلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن یہ حرکت بھی ناکام ہوئی اور حنین کی شکست کے ساتھ عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو گیا کہ اسے اب دار الاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعہ پر پورا ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا اور نظام جاہلیت کے صرف چند پراگندہ عناصر ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے۔ اس نتیجہ کے حد کمال تک پہنچنے میں اُن واقعات سے اور زیادہ مدد ملی جو شمال میں سلطنت روم کی سرحد پر اسی زمانہ میں پیش آ رہے تھے۔ وہاں جس جرأت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار کا زبردست لشکر لے کر گئے اور رومیوں نے آپ کے مقابلہ پر آنے سے پہلو تہی کر کے جو کمزوری دکھائی اس نے تمام عرب پر آپ کی اور آپ کے دین کی دھاک بٹھا دی اور اس کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ تبوک سے واپس آتے ہی حضور کے پاس عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہوئے اور اسلام و اطاعت کا اقرار کرنے لگے۔[1] چنانچہ اسی کیفیت کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوئی اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں)۔

رومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کی ابتدا فتح مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے

۱؎ محدثین نے اس موقع پر جن قبائل اور امراء و ملوک کے وفود کا ذکر کیا ہے ان کی مجموعی تعداد۔ تک پہنچی ہے جو عرب کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب ہر علاقے سے آئے تھے۔

کے لیے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحد شام سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان لوگوں نے ذات الطلح (یا ذات اطلاح) کے مقام پر اس وفد کے ۱۵ آدمیوں کو قتل کر دیا اور صرف رئیس وفد کعب بن عُمیر غفاری بچ کر واپس آئے۔ اسی زمانہ میں حضورؐ نے بُصریٰ کے رئیس شُرَحبِیل بن عَمرو کے نام بھی دعوت اسلام کا پیغام بھیجا تھا، مگر اس نے آپ کے ایلچی حارث بن عُمیر کو قتل کر دیا۔ یہ رئیس بھی عیسائی تھا اور براہ راست قیصر روم کے احکام کا تابع تھا۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحد شام کی طرف بھیجی تاکہ آئندہ کے لیے یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے پُر امن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ فوج جب معان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلہ پر آ رہا ہے اور خود قیصر روم حِمص کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے۔ لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود ۳ ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور مُوتَہ کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس تہوّر کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجاہدین اسلام بالکل پس جاتے، لیکن سارا عرب اور تمام مشرق قریب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو، بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو کسریٰ کے زیر اثر تھے، اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سُلَیم (جن کے سردار عباس بن مرداس سُلمی تھے) اور اشجع اور غَطفان اور ذُبیان اور فَزارہ کے لوگ اسی زمانہ میں داخل اسلام ہوئے۔ اور اسی زمانہ میں سلطنت روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فَروَہ بن عمرو الجذامی مسلمان ہوا اور اس نے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ جب قیصر نے اسے گرفتار کر کے اس کے سامنے ترک اسلام و بحالی منصب یا قتل میں سے ایک چیز قبول کر لینے کا سوال پیش کیا تو اس نے قتل کو ترجیح دی اور راہ حق میں جان دے دی۔ یہی چیز تھی جس نے قیصر کو اس خطرے کی حقیقی اہمیت محسوس کرائی جو عرب سے اٹھ کر اس کی سلطنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔



دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوۂ موتہ کی سزا دینے کے لیے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، جو ہر وقت ہر اس چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی خبردار رہتے تھے جس کا اسلامی تحریک پر کچھ بھی موافق یا مخالف اثر پڑتا ہو، ان تیاریوں کے معنی فوراً سمجھ گئے اور آپ نے بغیر کسی تامل کے قیصر کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت، جس پر حنین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی، پھر جی اٹھتی۔ دوسری طرف مدینہ کے منافقین جو ابو عامر راہب کے واسطے سے غسّان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے اور جنہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر دین داری کا پردہ ڈالنے کے لیے مدینہ سے متصل ہی مسجد ضرار تعمیر کر رکھی تھی، بغل میں چھری گھونپ دیتے۔ اور سامنے سے قیصر جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا، سامنے سے حملہ آور ہو جاتا۔ اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔ اس لیے باوجود اس کے کہ ملک میں

قحط سالی تھی، گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا، فصلیں پکنے کے قریب تھیں، سواریوں اور سرو سامان کا انتظام سخت مشکل تھا، سرمایہ کی بہت کمی تھی اور دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ درپیش تھا۔ خدا کے نبی نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوت حق کی زندگی و موت کے فیصلہ کی گھڑی ہے، اسی حال میں تیاری جنگ کا اعلان عام کر دیا۔ پہلے تمام غزوات میں تو حضور کا قاعدہ تھا کہ آخر وقت تک کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کدھر جانا ہے اور کس سے مقابلہ درپیش ہے، بلکہ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی منزل مقصود کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے، لیکن اس موقع پر آپ نے یہ پردہ بھی نہ رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

اس موقع کی نزاکت کو عرب میں سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ جاہلیت قدیمہ کے بچے کچھے عاشقوں کے لیے یہ ایک آخری شعاع امید تھی اور روم و اسلام کی اس ٹکر کے نتیجہ پر وہ بے چینی کے ساتھ نگاہیں لگائے ہوئے تھے، کیونکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر کہیں سے امید کی جھلک نہیں دکھائی دیتی ہے۔ منافقین نے بھی اپنی آخری بازی اسی پر لگا دی تھی اور وہ اپنی مسجد ضرار بنا کر اس انتظار میں تھے کہ شام کی جنگ میں اسلام کی قسمت کا پانسہ پلٹے تو ادھر اندرون ملک میں وہ اپنے فتنہ کا علم بلند کریں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس مہم کو ناکام کرنے کے لیے تمام ممکن تدبیریں بھی استعمال کر ڈالیں۔ ادھر مومنین صادقین کو بھی پورا احساس تھا کہ جس تحریک کے لیے ۲۲ سال سے وہ سربکف رہے ہیں اس وقت اس کی قسمت ترازو میں ہے، اس موقع پر جرأت دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ اس تحریک کے لیے ساری دنیا پر چھا جانے کا دروازہ کھل جائے، اور کمزوری دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ عرب میں بھی اس کی بساط الٹ جائے۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ ان فدائیان حق نے انتہائی جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سرو سامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کر دی۔ غریب صحابیوں نے محنت مزدوری کر کر کے جو کچھ کمایا لا کر حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر بھیجے۔ سرفروش والنٹیروں کے لشکر ہر طرف سے امنڈ امنڈ کر آنے شروع ہوئے اور انھوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ جن کو سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسول پاک کا دل بھر آتا تھا۔ یہ موقع عملاً ایمان اور نفاق کے امتیاز کی کسوٹی بن گیا تھا حتیٰ کہ اس وقت پیچھے رہ جانے کے معنی یہ تھے کہ اسلام کے ساتھ آدمی کے تعلق کی صداقت ہی مشتبہ ہو جائے۔ چنانچہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے دوران سفر میں جو جو شخص پیچھے رہ جاتا تھا صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیتے تھے اور جواب میں حضور برجستہ فرماتے تھے کہ دعوہ فان یک فیہ خیر فسیلحقہ اللہ بکم وان یک غیر ذٰلک فقد اراحکم اللہ منہ (جانے دو، اگر اس میں کچھ بھلائی ہے تو اللہ اسے پھر تمھارے ساتھ لا ملائے گا اور اگر کچھ دوسری حالت ہے تو شکر کرو کہ اللہ نے اس کی جھوٹی رفاقت سے تمھیں خلاصی بخشی)

رجب ۹ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے جن میں دس ہزار سوار تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت مستزاد۔ مگر جس عزم صادق کا ثبوت اس نازک موقع پر مسلمانوں نے دیا اس کا ثمرہ تبوک پہنچ کر انھیں نقد مل گیا۔ وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ قیصر اور اس کے تابعین نے مقابلہ پر آنے کے بجائے اپنی فوجیں سرحد سے ہٹا لی ہیں اور اب کوئی دشمن موجود نہیں ہے کہ اس سے جنگ کی جائے۔ سیرت نگار بالعموم اس

واقعہ کو اس انداز سے لکھ جاتے ہیں کہ گویا وہ خبر ہی سرے سے غلط نکلی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رومی افواج کے اجتماع کے متعلق ملی تھی۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ قیصر نے اجتماعِ افواج شروع کیا تھا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ پر پہنچ گئے تو اس نے سرحد سے فوجیں ہٹا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ غزوۂ موتہ میں ۳ ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلہ کی جو شان وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نبی کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں وہ لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا۔

قیصر کے یوں طرح دے جانے سے جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور بجائے اس کے کہ تبوک سے آگے بڑھ کر سرحد شام میں داخل ہوتے، آپ نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس فتح سے انتہائی ممکن سیاسی و حربی فوائد حاصل کر لیں۔ چنانچہ آپ نے تبوک کے بست روزہ قیام میں ان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم اور دارالاسلام کے درمیان واقع تھیں اور اب تک رومیوں کے زیر اثر رہی تھیں، فوجی دباؤ ڈال کر سلطنت اسلامی کا باجگذار اور تابع امر بنالیا۔ اس سلسلہ میں دُومۃ الجَندل کے عیسائی رئیس اُکَیدِر بن عبدالملک کندی، اَیلہ کے عیسائی رئیس یوحنا بن رُؤبہ، اور اسی طرح مقنا، جرباء اور اَذرُح کے نصرانی رؤساء نے بھی جزیہ ادا کر کے مدینہ کی تابعیت قبول کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حدود اقتدار براہ راست رومی سلطنت کی سرحد تک پہنچ گئے اور جن عرب قبائل کو قیصر روم اب تک عربوں کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے، اب ان کا بیشتر حصہ رومیوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کا معاون بن گیا۔ پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سلطنت روم کے ساتھ ایک طویل کشمکش میں الجھ جانے سے پہلے اسلام کو عرب پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے کا پورا موقع مل گیا۔ تبوک کی اس فتح بلا جنگ نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے، خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردہ میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمت ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد جو ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی تو وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی جس کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھنے کے بعد ہم بآسانی اُن بڑے بڑے مسائل کا احصاء کر سکتے ہیں جو اس وقت درپیش تھے اور جن سے سورہ توبہ میں تعرض کیا گیا ہے:

(۱) اب چونکہ عرب کا نظم و نسق بالکلیہ اہل ایمان کے ہاتھ میں آگیا تھا اور تمام مزاحم طاقتیں بے بس ہو چکی تھیں اس لیے وہ پالیسی واضح طور پر سامنے آجانی چاہیے تھی جو عرب کو مکمل دارالاسلام بنانے کے لیے اختیار کرنی ضروری تھی چنانچہ وہ حسب ذیل صورت میں پیش کی گئی:

الف۔ عرب سے شرک کو قطعاً مٹا دیا جائے اور قدیم مشرکانہ نظام کا قطعی استیصال کر ڈالا جائے تاکہ مرکز اسلام ہمیشہ کے لیے خالص اسلامی مرکز ہو جائے اور کوئی دوسرا عنصر اس کے اسلامی مزاج میں نہ تو خلل انداز ہو سکے اور نہ کسی خطرے کے موقع پر اندرونی فتنہ کا موجب بن سکے۔ اسی غرض کے لیے مشرکین سے برأت اور ان کے ساتھ معاہدوں کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

ب۔ کعبہ کا انتظام اہل ایمان کے ہاتھ میں آجانے کے بعد یہ بالکل نامناسب تھا کہ جو گھر خالص خدا کی پرستش کے لیے وقف کیا گیا تھا اس میں بدستور شرک ہوتا رہے اور اس کی تولیت بھی مشرکین کے قبضہ میں رہے۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ کعبہ کی تولیت بھی اہل توحید کے قبضہ میں رہنی چاہیے اور بیت اللہ کے حدود میں شرک و جاہلیت کی تمام رسمیں بھی بزور بند کر دینی چاہئیں، بلکہ اب مشرکین اس گھر کے

قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں تاکہ اس خانۂ ابراہیمی کے آلودۂ شرک ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ج۔ عرب کی تمدنی زندگی میں رسوم جاہلیت کے جو آثار ابھی تک باقی تھے ان کو جدید اسلامی دور میں جاری رہنا کسی طرح درست نہ تھا اس لیے ان کے استیصال کی طرف توجہ دلائی گئی۔ نسی کا قاعدہ ان رسوم میں سب سے زیادہ بدنما تھا اس لیے اس پر براہ راست ضرب لگائی گئی اور اسی ضرب سے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ بقیہ آثار جاہلیت کے ساتھ انھیں کیا کرنا چاہیے۔

(۲) عرب میں اسلام کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر دین حق کا دائرہ اثر پھیلایا جائے۔ اس معاملہ میں روم و ایران کی سیاسی قوت سب سے بڑی سد راہ تھی اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہوتے ہی اس سے تصادم ہو۔ نیز آگے چل کر دوسرے غیر مسلم سیاسی و تمدنی نظاموں سے بھی اسی نوعیت کا معاملہ پیش آنا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ عرب کے باہر جو لوگ دین حق کے پیرو نہیں ہیں ان کی خود مختارانہ فرمانروائی کو بزور شمشیر ختم کر دو تا آنکہ وہ اسلامی اقتدار کے تابع ہو کر رہنا قبول کر لیں۔ جہاں تک دین حق پر ایمان لانے کا تعلق ہے ان کو اختیار ہے کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر اپنا حکم جاری کریں اور انسانی سوسائٹی کی زمام کار اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گمراہیوں کو خلق خدا پر اور ان کی آنے والی نسلوں پر بزور مسلط کرتے رہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس آزادی کے استعمال کا انھیں اختیار دیا جا سکتا ہے وہ بس اسی حد تک ہے کہ خود اگر گمراہ رہنا چاہتے ہیں تو رہیں بشرطیکہ جزیہ دے کر اسلامی اقتدار کے مطیع بنے رہیں۔

(۳) تیسرا اہم مسئلہ منافقین کا تھا جن کے ساتھ اب تک وقتی مصالح کے لحاظ سے چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کیا جا رہا تھا۔ اب چونکہ بیرونی خطرات کا دباؤ کم ہو گیا تھا بلکہ گویا نہیں رہا تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے اور وہی سخت برتاؤ ان چھپے ہوئے منکرین حق کے ساتھ بھی ہو جو کھلے منکرین حق کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی پالیسی تھی جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانہ میں سُوَیلِم کے گھر میں آگ لگوا دی جہاں منافقین کا ایک گروہ اس غرض سے جمع ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو شرکت جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرے، اور اسی پالیسی کے تحت تبوک سے واپس تشریف لاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد ضرار کو ڈھانے اور جلا دینے کا حکم دے دیا۔

(۴) مومنین صادقین میں اب تک جو تھوڑا بہت ضعف عزم باقی تھا اس کا علاج بھی ضروری تھا کیونکہ اسلام عالمگیر جدوجہد کے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا، اور اس مرحلہ میں جبکہ اکیلے مسلم عرب کو پوری غیر مسلم دنیا سے ٹکرانا تھا، ضعف ایمان سے بڑھ کر کوئی اندرونی خطرہ اسلامی جماعت کے لیے نہ تھا۔ اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقع پر سستی اور کمزوری دکھائی تھی ان کو نہایت شدت کے ساتھ ملامت کی گئی، پیچھے رہ جانے والوں کے اس فعل کو کہ وہ بلا عذر معقول پیچھے رہ گئے بجائے خود ایک منافقانہ طرز عمل، اور ایمان میں ان کے ناراست ہونے کا ایک بین ثبوت قرار دیا گیا، اور آئندہ کے لیے پوری صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کر دی گئی کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور کفر و اسلام کی کشمکش ہی وہ اصلی کسوٹی ہے جس پر مومن کا دعوائے ایمان پرکھا جائے گا۔ جو اس آویزش میں اسلام کے لیے جان و مال اور وقت و محنت صرف کرنے سے جی چرائے گا اس کا ایمان معتبر نہ ہوگا اور اس پہلو کی کسر کسی دوسرے مذہبی عمل سے پوری نہ ہو سکے گی۔

ان امور کو نظر میں رکھ کر سورہ توبہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے تمام مضامین بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

اعلانِ[1] براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔[2] پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اطلاعِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن[4] تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور

۱؎ جیسا کہ ہم سورہ کے دیباچہ میں بیان کر چکے ہیں، یہ خطبہ رکوع ۵ کے آخر تک ۹ھ میں اس وقت نازل ہوا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لیے روانہ کر چکے تھے۔ ان کے پیچھے جب یہ نازل ہوا تو صحابہ کرام نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اسے ابوبکرؓ کو بھیج دیجیے تاکہ وہ حج میں اس کو سنا دیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اس اہم معاملہ کا اعلان میری طرف سے میرے ہی گھر کے کسی آدمی کو کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس خدمت پر مامور کیا، اور ساتھ ہی ہدایت فرما دی کہ حاجیوں کے مجمع عام میں اسے سنانے کے بعد حسب ذیل چار باتوں کا بھی اعلان کر دیں: (۱) جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دینِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ (۲) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ (۳) بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔ (۴) جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا معاہدہ باقی ہے، یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں، ان کے ساتھ مدتِ معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔

۲؎ سورہ انفال رکوع ۷ میں گزر چکا ہے کہ جب تمہیں کسی قوم سے خیانت (نقضِ عہد اور غداری) کا اندیشہ ہو تو علی الاعلان اس کا معاہدہ اس کی طرف پھینک دو اور اسے خبردار کر دو کہ اب ہمارا تم سے کوئی معاہدہ باقی نہیں ہے۔ اس اعلان کے بغیر کسی معاہد قوم کے خلاف جنگی کارروائی شروع کر دینا خود خیانت کا مرتکب ہونا ہے۔ اسی ضابطۂ اخلاق کے مطابق معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلانِ عام ان تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور موقع پاتے ہی پاسِ عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اتر آتے تھے۔ اور یہ کیفیت بنی کنانہ اور بنی ضمرہ اور شاید ایک آدھ اور قبیلے کے سوا باقی تمام ان قبائل کی تھی جو اس وقت تک شرک پر قائم تھے۔ پس اس اعلان کے ساتھ ہی عرب میں شرک اور مشرکین کا وجود گویا عملاً خلافِ قانون (Outlaw) ہو گیا اور ان کے لیے سارے ملک میں کوئی جائے پناہ نہ رہی، کیونکہ ملک کا غالب حصہ اسلام کے زیرِ حکم آ چکا تھا۔ یہ لوگ تو اپنی جگہ اس بات کے منتظر تھے کہ روم و فارس سے اسلامی سلطنت کو جب کوئی خطرہ لاحق ہو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا جائیں تو یکایک نقضِ عہد کر کے ملک میں خانہ جنگی برپا کر دیں۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول نے ان کی ساعتِ منتظرہ آنے سے پہلے ہی بساط ان پر الٹ دی اور اعلانِ براءت کر کے ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہنے دیا کہ یا تو لڑنے پر تیار ہو جائیں اور اسلامی طاقت سے ٹکرا کر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں، یا ملک چھوڑ کر نکل جائیں، یا پھر اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو اور اپنے علاقہ کو اُس نظم و ضبط کی گرفت میں دے دیں جو ملک کے بیشتر حصہ کو پہلے ہی منضبط کر چکا تھا۔ اس عظیم الشان تدبیر کی پوری حکمت اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جبکہ ہم اس فتنۂ ارتداد کو نظر میں رکھیں جو اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ملک کے مختلف گوشوں میں برپا ہوا اور جس نے اسلام کے نوتعمیر قصر کو یکلخت متزلزل کر دیا۔ اگر کہیں ۹ھ کے اس اعلانِ براءت سے شرک کی منظم طاقت ختم نہ کر دی گئی ہوتی اور پورے ملک پر اسلام کی قوتِ ضابطہ کا استیلاء پہلے ہی مکمل نہ ہو چکا ہوتا تو ارتداد کی شکل میں جو فتنہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آغاز میں اٹھا تھا اُس سے کم از کم دس گنی زیادہ طاقت کے ساتھ بغاوت اور خانہ جنگی کا فتنہ اٹھتا اور شاید تاریخِ اسلام کی شکل اپنی موجودہ صورت سے بالکل ہی مختلف ہوتی۔

۳؎ یہ اعلان ۱۰ ذی الحجہ کو ہوا تھا۔ اُس وقت سے ۱۰ ربیع الثانی تک چار مہینہ کی مہلت ان لوگوں کو دی گئی کہ اس دوران میں اپنی پوزیشن پر اچھی طرح غور کر لیں۔ لڑنا ہو تو لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ ملک چھوڑنا ہو تو اپنی جائے پناہ تلاش کر لیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو سوچ سمجھ کر قبول کر لیں۔

۴؎ یعنی یوم النحر، جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ حجۃ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے حاضرین سے پوچھا یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا یوم النحر ہے۔ فرمایا ھٰذا یوم الحج الاکبر (یوم النحر سے مراد ۱۰ ذی الحجہ ہے)۔

جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی! انکار کرنے والوں کو سخت سزا کی خوشخبری سنا دو۔ بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انھوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔[1]

پس جب حرام مہینے[2] گذر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو[3] کہ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمھارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دیدو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔[4] ع ۱

ان مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے — بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا[5] تو جب تک وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے — مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمھارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا۔ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں[6] اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔[7] انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کرلی[8] پھر اللہ کے راستے میں سدِّ راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔[9] بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ

---

[1] یعنی یہ بات تقویٰ کے خلاف ہوگی کہ جنھوں نے تم سے کوئی عہد شکنی نہیں کی ان سے تم عہد شکنی کرو۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ صرف وہی لوگ ہیں جو ہر حال میں تقویٰ پر قائم رہیں۔

[2] یہاں حرام مہینوں سے اصطلاحی اشہرِ حُرُم مراد نہیں ہیں جو حج اور عمرہ کے لیے حرام قرار دیے گئے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ چار مہینے ہیں جن کی اوپر مشرکین کو مہلت دی گئی ہے۔ اس مہلت کے زمانہ میں مسلمانوں کے لیے جائز نہ تھا کہ مشرکین پر حملہ آور ہو جاتے اس لیے انھیں حرام مہینے فرمایا گیا ہے۔

[3] یعنی اگر وہ کفر و شرک سے باز آجائیں اور اسلام قبول کرکے نماز و زکوٰۃ کی پابندی اختیار کرلیں، یا بالفاظ دیگر اسلامی نظامِ زندگی میں جذب ہو جائیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اسی آیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنہ ارتداد کے زمانہ میں استدلال کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم اسلام کے منکر نہیں ہیں، نماز بھی پڑھنے کے لیے تیار ہیں، مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ صحابہ کرام کو بالعموم یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ایسے لوگوں کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جاسکتی ہے۔ مگر حضرت ابوبکر نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں تو ان لوگوں کو چھوڑ دینے کا حکم صرف اس صورت میں دیا گیا تھا جبکہ یہ شرک سے توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ مگر جب یہ تین شرطوں میں سے ایک شرط اڑا دیتے ہیں تو پھر انھیں ہم کیسے چھوڑ دیں۔ [4] یعنی دورانِ جنگ میں اگر کوئی دشمن تم سے درخواست کرے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے امان دے کر اپنے ہاں آنے کا موقع دیں اور اسے سمجھائیں، پھر اگر وہ قبول نہ کرے تو اسے اپنی حفاظت میں اس کے ٹھکانے تک واپس پہنچا دیں۔ [5] یعنی بنی کنانہ اور بنی خزاعہ

[6] یعنی بظاہر تو وہ صلح کی شرطیں طے کرتے ہیں مگر دل میں بدعہدی کا ارادہ ہوتا ہے اور اس کا ثبوت تجربے سے اس طرح ملتا ہے کہ جب کبھی انھوں نے معاہدہ کیا توڑنے ہی کے لیے کیا۔

[7] یعنی ایسے لوگ ہیں جنھیں نہ اخلاقی ذمہ داریوں کا کوئی احساس ہے اور نہ اخلاق کی پابندیوں کے توڑنے میں کوئی باک۔

[8] یعنی ایک طرف اللہ کی آیات تھیں جو نیکی اور بھلائی اور حدود اللہ کی پابندی کی طرف دعوت دیتی تھیں، اور دوسری طرف دنیا کے وہ چند روزہ فائدے تھے جو آزادی کے ساتھ ہوائے نفس کے پیچھے چلنے ہی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں نے دونوں چیزوں کو دیکھا اور ان کا موازنہ کیا، پھر پہلی چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اختیار کرلیا۔

[9] یعنی ان ظالموں نے اسی پر بھی اکتفا نہ کیا کہ ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرلیا ہوتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے کوشش یہ کی کہ دعوتِ حق کا کام کسی طرح (باقی صفحہ ۲۷ پر)۔

میں نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پس اگر اب یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور جاننے والوں کے لیے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں۔[۱۳] اور اگر عہد (اسلام و اطاعت کا عہد) کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں[۱۴] اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔[۱۵]

کیا تم نہ لڑو گے[۱۶] ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) چلنے نہ پائے، خیر و صلاح کی اس پکار کو کوئی سننے نہ پائے بلکہ وہ منزلیں بند کر دیے جائیں جن سے یہ پکار بلند ہوتی ہے جس سانچے زندگی کو اللہ تعالیٰ زمین میں قائم کرنا چاہتا تھا اس کے قیام کے روکنے میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو اس نظام کو حق پا کر اس کے متبع بنے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۳ جاننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کا انجام جانتے ہیں اور اس کا کچھ خوف اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ اگر ایسا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شرائط پوری کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ تمہارے لیے ان پر ہاتھ اٹھانا اور ان کے جان و مال سے تعرض کرنا حرام ہو جائے گا بلکہ مزید برآں اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کو برابر کے حقوق حاصل ہو جائیں گے، معاشرتی، تمدنی اور قانونی حیثیت سے وہ تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح ہوں گے اور کوئی فرق و امتیاز ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوگا۔

۱۴ اس آیت کے ظاہری الفاظ تو اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے عہد توڑ دیں تو ان سے لڑو۔ لیکن نظم کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد سے مراد اسلام اور اطاعتِ امر کا عہد ہے، کیونکہ معاہدات کو تو پہلے ہی ساقط کیا جا چکا تھا اور اب آئندہ ان سے کوئی معاہدہ کرنا سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا لہٰذا یہاں خلاف ورزی معاہدہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ آیت اوپر والی آیت کے مابعد آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی قبول کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ "اگر وہ اپنی قسمیں توڑ دیں" صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے مراد ان کا اسلام قبول کرنے اور اسلامی نظام جماعت کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دینا ہے۔

۱۵ دراصل اس آیت میں اس فتنۂ ارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال بعد خلافت صدیقی کی ابتدا میں برپا ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر جو طرز عمل اختیار کیا وہ ٹھیک اس ہدایت کے مطابق تھا جو اس آیت میں پہلے ہی دی جا چکی تھی۔

۱۶ اب تقریر کا رخ مسلمانوں کی طرف پھرتا ہے اور ان کو جنگ پر ابھارنے اور دین کے معاملہ میں کسی رشتہ و قرابت اور کسی دنیوی مصلحت کا لحاظ نہ کرنے کی پرزور تلقین کی جاتی ہے۔ اس حصہ تقریر کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے پھر ایک مرتبہ اس صورت حال کو سامنے رکھ لینا چاہیے جو اس وقت درپیش تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اب ملک کے ایک بڑے حصہ پر چھا گیا تھا اور عرب میں کوئی ایسی بڑی طاقت نہ رہی تھی جو اس کو دعوت مبارزت دے سکتی۔ لیکن پھر بھی جو فیصلہ کن قدم اور انتہائی انقلابی قدم اس موقع پر اٹھایا جا رہا تھا اس کے اندر بہت سے خطرناک پہلو ظاہر بیں نگاہوں کو نظر آ رہے تھے:-

اولاً تمام مشرک قبائل کو بیک وقت معاہدات کی منسوخی کا چیلنج دے دینا، پھر مشرکین کے حج کی بندش، کعبے کی تولیت میں تغیر، اور رسوم جاہلیت کا کلی انسداد یہی معنی رکھتا تھا کہ ایک مرتبہ سارے ملک میں آگ سی لگ جائے اور مشرکین و منافقین اپنا آخری قطرۂ خون اپنے مفادات اور تعصبات کی حفاظت کے لیے بہا دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

ثانیاً حج کو صرف اہل توحید کے لیے مخصوص کر دینے اور مشرکین پر کعبے کا راستہ بند کر دینے کے معنی یہ تھے کہ ملک کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ کعبہ کی طرف اس نقل و حرکت سے باز رہ جائے جو صرف مذہبی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ معاشی حیثیت سے بھی عرب میں غیر معمولی حیثیت رکھتی تھی اور جس پر اس زمانہ میں عرب کی معاشی زندگی کا بہت بڑا انحصار تھا۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

دی تھی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا، اور انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کریگا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دیگا، اور اللہ جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دیگا۔[۵۱] اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔ کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنھوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دلی دوست نہ بنایا؟[۵۲] جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع ۲

مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں درانحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔[۵۳] ان کے تو سارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) تھا۔ جو لوگ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے ان کے لیے یہ معاملہ بڑی کڑی آزمائش کا تھا کیونکہ ان کے بہت سے بھائی بند، عزیز اقارب ابھی تک مشرک تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے مفاد قدیم نظام جاہلی کے مناصب سے وابستہ تھے۔ اب جو مشرکین کے خلاف (War of annihilation) (جنگِ فنا) کا اعلان کیا گیا تو بلحاظ ظاہر، یہ معنی تھے کہ مسلمان خود اپنے ہاتھوں اپنے خاندانوں اور اپنے جگرگوشوں کو پیوند خاک کر دیں، ان کے جاہ و منصب صدیوں کے قائم شدہ امتیازات کا خاتمہ کر دیں۔

اگرچہ فی الواقع ان میں سے کوئی خطرہ بھی عملاً بروئے کار نہیں آیا۔ اعلان برأت سے ملک میں حرب کلی کی آگ بھڑکنے کے بجائے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ تمام اطراف و اکناف عرب کے بچے کھچے مشرک قبائل اور امراء و ملوک کے وفد آنے شروع ہو گئے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسلام و اطاعت کا عہد کیا اور ان کے اسلام قبول کر لینے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کو اس کی پوزیشن پر بحال رکھا۔ لیکن جس وقت اس نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا اس وقت تو بہرحال کوئی بھی اس نتیجہ کو پیشگی نہ دیکھ سکتا تھا نیز یہ کہ اس اعلان کے ساتھ ہی اگر مسلمان اسے بزور نافذ کرنے کے لیے پوری طرح تیار نہ ہو جاتے تو شاید یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو اس موقع پر جہاد فی سبیل اللہ کی پرجوش تلقین کی جاتی، اور ان کے ذہن سے ان تمام اندیشوں کو دور کیا جاتا جو اس پالیسی پر عمل کرنے میں ان کو نظر آ رہے تھے، اور ان کو ہدایت کی جاتی کہ اللہ کی مرضی پوری کرنے میں انھیں دنیا کی کسی چیز کی پروا نہ کرنی چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یہاں اشارہ ہے اُس امکان کی طرف جو آگے چل کر واقعہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ مسلمان جو یہ سمجھ رہے تھے کہ بس اس اعلان کے ساتھ ہی ملک میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی، ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اشارۃً انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ پالیسی اختیار کرنے میں جہاں اس کا امکان ہے کہ ہنگامۂ جنگ برپا ہوگا وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی۔ لیکن اس اشارہ کو زیادہ نمایاں اس لیے نہیں کیا گیا کہ ایسا کرنے سے ایک طرف تو مسلمانوں کی تیاری جنگ ڈھیلی پڑ جاتی اور دوسری طرف مشرکین کے لیے اُس دھمکی کا پہلو بھی خفیف ہو جاتا جس نے انھیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی پوزیشن کی نزاکت پر غور کرنے اور بالآخر نظامِ اسلامی میں جذب ہو جانے پر آمادہ کیا۔

[۵۲] یعنی جب تک یہ دونوں چیزیں محقق نہ ہو جائیں تمہارا ایمان معتبر کب ہے۔ اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزر کر جب تم ثابت کر دو گے کہ واقعی تم خدا اور اس کے دین سے نہ اپنی جان و مال کو عزیز تر رکھتے ہو اور نہ اپنے باپوں اور بیٹوں اور بھائیوں کو، تب ہی تم سچے مومن قرار دیے جا سکتے ہو۔ ورنہ اب تک تو ظاہر کے لحاظ سے تمہاری پوزیشن یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنین صادقین اور سابقین اولین کی جانفشانیوں سے غالب آ گیا اور ملک پر چھا گیا اس لیے تم مسلمان ہو گئے۔

[۵۳] یعنی جو مسجدیں خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنی ہوں، ان کے متولی، مجاور، خادم اور آباد کار بننے کیلئے وہ لوگ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے جو خدا کے ساتھ خدائی کی صفات، حقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہوں۔ پھر جب کہ وہ خود بھی توحید کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر چکے ہوں اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہو کہ ہم اپنی بندگی و عبادت کو ایک خدا کے لیے خاص کرنے پر تیار نہیں ہیں تو آخر انھیں کیا حق ہے کہ کسی ایسی عبادت گاہ کے متولی بنے رہیں جو صرف خدا کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہو۔

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

اعمال ضائع ہوگئے[19] اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت کو مانیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟[20] اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جانفشانیاں کیں، وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کے سامان ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ اور تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں
ع۳ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے[21] اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے[22] اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) یہاں اگرچہ بات عام کہی گئی ہے اور دینی حقیقت کے لحاظ سے یہ عام ہے بھی، لیکن خاص طور پر یہاں اس کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ اور مسجد حرام پر سے مشرکین کی تولیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس پر ہمیشہ کے لیے اہلِ توحید کی تولیت قائم کر دی جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [19] یعنی جو تھوڑی بہت واقعی خدمت انھوں نے بیت اللہ کی انجام دی وہ بھی اس وجہ سے ضائع ہوگئی کہ یہ لوگ اس کے ساتھ شرک اور جاہلانہ طریقوں کی آمیزش کرتے رہے اور تھوڑی سی صلاح کو بہت بڑا فساد باطل کرتا رہا۔ [20] یعنی کسی زیارت گاہ کی سجادہ نشینی و مجاوری اور چند نمائشی مذہبی اعمال کی بجا آوری جس پر دنیا کے سطحی بین لوگ بالعموم شرف اور تقدس کا مدار رکھتے ہیں، خدا کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ اصلی قدر و قیمت ایمان اور راہِ خدا میں قربانی کی ہے۔ ان صفات کا جو شخص بھی حامل ہو وہ قیمتی آدمی ہے، خواہ وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور کسی قسم کے امتیازی طرے اس کو لگے ہوئے نہ ہوں۔ لیکن جو لوگ ان صفات سے خالی ہیں وہ محض اس لیے کہ بزرگ زادے ہیں اور سجادگی ان کے خاندان میں مدتوں سے چلی آ رہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی مراسم کی نمائش وہ بڑی شان کے ساتھ کر دیا کرتے ہیں، نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت "موروثی حقوق" کو تسلیم کر کے دینی معابد ان نالائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دیے جائیں۔

[21] یعنی تمہیں ہٹا کر سچی دینداری کی نعمت اور اس کی علمبرداری کا شرف اور رشد و ہدایت کی پیشوائی کا منصب کسی اور گروہ کو عطا کر دے۔

[22] جو لوگ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اعلانِ براءت کی خطرناک پالیسی پر عمل کرنے سے تمام ملک کے گوشے گوشے میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی اور اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا، ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان اندیشوں سے کیوں ڈرے جاتے ہو، جو خدا اس سے بہت زیادہ سخت خطرات کے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے وہ اب بھی تمہاری مدد کو موجود ہے۔ اگر یہ کام تمہاری قوت پر منحصر ہوتا تو مکہ ہی سے آگے نہ بڑھتا، ورنہ بدر میں تو ضرور ہی ختم ہو جاتا۔ مگر اس کی پشت پر تو اللہ کی طاقت ہے اور پچھلے تجربات تم پر ثابت کر چکے ہیں کہ اللہ ہی کی طاقت اب تک اس کو فروغ دیتی رہی ہے۔ لہٰذا یقین رکھو کہ آج بھی وہی اسے فروغ دے گی۔ (باقی صفحہ ۳۰ پر)

سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے[۲۴]، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے ایمان لانے والو! مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجدِ حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں[۲۵]۔ اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے، اللہ علیم و حکیم ہے۔

جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے[۲۶] اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے[۲۷] اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں[۲۸]۔ یہودی ع۴

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) غزوۂ حنین جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے شوال ۸ھ میں ان آیات کے نزول سے صرف بارہ تیرہ مہینے پہلے طائف کے قریب پیش آیا تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی طرف سے ۱۲ ہزار فوج تھی جو اس سے پہلے کبھی کسی اسلامی غزوہ میں اکٹھی نہیں ہوئی تھی، اور دوسری طرف کفار ان سے بہت کم تھے۔ لیکن اس کے باوجود قبیلۂ ہوازن کے تیر اندازوں نے ان کا منہ پھیر دیا اور لشکرِ اسلام بری طرح تتر بتر ہو کر پسپا ہوا۔ اس وقت صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چند مٹھی بھر جانباز صحابہ تھے جن کے قدم اپنی جگہ جمے رہے اور انہی کی ثابت قدمی کا نتیجہ تھا کہ دوبارہ فوج کی ترتیب قائم ہو سکی اور بالآخر فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی، ورنہ فتح مکہ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا اس سے بہت زیادہ حنین میں کھو دینا پڑتا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۲۴ غزوۂ حنین میں فتح حاصل کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شکست خوردہ دشمنوں کے ساتھ جس فیاضی و کریم النفسی کا برتاؤ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بیشتر آدمی مسلمان ہو گئے۔ اس مثال سے مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم نے یہی کیوں سمجھ رکھا ہے کہ بس اب سارے مشرکِ عرب تہس نہس ہی کر ڈالے جائیں گے۔ نہیں، پہلے کے تجربات کو دیکھتے ہوئے تو تم کو یہ توقع ہونی چاہیے کہ جب نظامِ جاہلیت کے فروغ و بحالی کی کوئی امید ان لوگوں کو باقی نہ رہے گی اور وہ سہارے ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے یہ اب تک جاہلیت کو چمٹے ہوئے ہیں تو خود بخود یہ اسلام کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کے لیے آ جائیں گے۔ ۲۵ یعنی آئندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں بلکہ مسجدِ حرام کے حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے تاکہ شرک و جاہلیت کے اعادہ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ "ناپاک" ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود ناپاک ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریقِ زندگی ناپاک ہیں، اور اسی نجاست کی بنا پر حدودِ حرم میں ان کا داخلہ بند کیا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عمرہ اور مراسمِ جاہلیت ادا کرنے کے لیے حدودِ حرم میں نہیں جا سکتے۔ امام شافعی کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجدِ حرام میں جا ہی نہیں سکتے۔ اور امام مالک یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجدِ حرام ہی نہیں بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا درست نہیں۔ لیکن یہ آخری رائے درست نہیں ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسجدِ نبوی میں ان لوگوں کو آنے کی اجازت دی تھی۔ ۲۶ اگرچہ اہلِ کتاب خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں لیکن فی الواقع نہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ خدا پر ایمان رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی بس اس بات کو مان لے کہ خدا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خدا کو الٰہِ واحد اور ربِّ واحد تسلیم کرے اور اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے حقوق اور اس کے اختیارات میں نہ خود شریک بنے نہ کسی کو شریک ٹھیرائے۔ لیکن نصاریٰ اور یہود دونوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیات میں تصریح بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کا خدا کو ماننا بے معنی ہے اور اسے ہرگز ایمان باللہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح آخرت کو ماننے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی یہ بات مان لے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے، بلکہ اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکے گا، خدا کی عدالت میں بے لاگ انصاف ہوگا اور آدمی کے ایمان و عمل کے سوا کسی چیز کا لحاظ نہ کیا جائے گا۔ اس عقیدے کے بغیر آخرت کو ماننا لاحاصل ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اسی پہلو سے اپنے عقیدے کو خراب کر لیا ہے لہٰذا ان کا ایمان بالآخرت بھی مسلم نہیں ہے۔ ۲۷ یعنی اس شریعت کو اپنا قانونِ زندگی نہیں بناتے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے نازل کی ہے۔

۲۸ یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دینِ حق کے پیرو بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہو جائے، وہ زمین میں حاکم اور صاحبِ امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظامِ زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات متبعینِ دینِ حق کے ہاتھوں میں آئیں اور وہ ان کے ماتحت تابع و مطیع بن کر رہیں۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

کہتے ہیں کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے[1] اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے[2]۔ اللہ کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے[3] اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) جزیہ بدل ہے اس امان اور اس رعایت اور اس حفاظت کا جس کے تحت ذمیوں کو اسلامی اقتدار میں اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دی جائے گی نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں۔ "ہاتھ سے جزیہ دینے" کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں وہ بڑے نہ ہوں بلکہ وہ اہل ایمان بڑے ہوں جو خلافت الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

ابتداءً یہ حکم یہود و نصاریٰ سے متعلق دیا گیا تھا لیکن آگے چل کر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس سے جزیہ لے کر انھیں ذمی بنایا اور اس کے بعد صحابہ کرام نے بالاتفاق بیرون عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔

یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لیے بڑی بڑی معذرتیں انیسویں صدی عیسوی کے دور ذلت میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور اس دور کی یادگار کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو صفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا کا دین اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے معذرت پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں لیکن انھیں اس کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرماں روائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی فساد رونما ہوگا اور اہل ایمان کا فرض ہوگا کہ ان کو اس سے بے دخل کر کے انھیں نظام صالح کا مطیع بنائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ جزیہ آخر کس چیز کی قیمت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو انھیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہی پر قائم رہنے کے لیے دی جاتی ہے، اور اس قیمت کو اس صالح نظام حکومت کے نظم و نسق پر صرف ہونا چاہیے جو انھیں اس آزادی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کرتے وقت ہر سال ذمیوں میں یہ احساس تازہ ہوتا رہے گا کہ خدا کی راہ میں زکوٰۃ دینے کے شرف سے محروم ہیں اور اس کے بجائے گمراہی پر قائم رہنے کی قیمت ادا کرنا کتنی بڑی بدقسمتی ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] عُزیر سے مراد عزرا (Ezra) ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کی روایات کے مطابق سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دور ابتلا بنی اسرائیل پر آیا اس میں نہ صرف یہ کہ تورات دنیا سے گم ہو گئی تھی بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت، اپنی روایات اور اپنی قومی زبان، عبرانی تک سے ناآشنا کر دیا تھا۔ آخر کار انہی عزیر یا عزرا نے کتب مقدسہ کو دوبارہ لکھا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا۔ یہاں قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی رونما ہوئی وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عزیر کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہوئے۔ [2] یعنی مصر، یونان، روم، ایران اور دوسرے ممالک میں جو قومیں پہلے گمراہ ہو چکی تھیں ان کے فلسفوں اور اوہام و تخیلات سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے بھی ویسے ہی گمراہانہ عقیدے ایجاد کر لیے۔ [3] حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم جو پہلے عیسائی تھے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انھوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک یہ سوال بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علما اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضور نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ یہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا بنا لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انھیں خدا بناتے ہیں۔ یہ دونوں الزام یعنی کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا، اور کسی کو شریعت سازی کا حق دے دینا، اس بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے مانتے ہوں مگر ان کا تصور خدائی اس قدر غلط ہے کہ اس کی وجہ سے ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔

نہیں ہے[31] خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے[32] خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے ایمان لانے والو! ان اہلِ کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں[33]۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے[34]، اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں[35]۔ یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔ لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو[36] اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں[37] اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔ نسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی ہو جائے اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی ہو جائے[38]۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ منکرینِ حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ع ۵

[31] پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، یعنی اپنی واہی باتوں اور شریر چالوں سے اس دعوتِ حق کو ناکام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ [32] متن میں الدین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے جنسِ دین کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثتِ رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے، بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے شاہی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔

[33] یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں، ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں اور ان کا مرنا جینا، شادی و غم کچھ بھی ان کو کھلائے بغیر نہ ہو سکے اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکہ دار ان کو سمجھیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی علمی فریب کاریوں اور مقدس مکاریوں کے حربے لے کر اس کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ [34] یعنی جب سے اللہ نے چاند، سورج اور زمین کو خلق کیا ہے اسی وقت سے یہ حساب بھی چلا آ رہا ہے کہ مہینے میں ایک ہی دفعہ چاند ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے اور اس حساب سے سال کے ۱۲ ہی مہینے بنتے ہیں۔

[35] یعنی رجب عمرے کے لیے اور ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے۔ [36] یعنی جن مصالح کی بنا پر ان مہینوں میں جنگ کرنا حرام کیا گیا ہے ان کو ضائع نہ کرو، اور ان ایام میں بدامنی پھیلا کر اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ [37] یعنی اگر مشرکین ان مہینوں میں بھی لڑنے سے باز نہ آئیں تو جس طرح وہ متفق ہو کر تم سے لڑتے ہیں تم بھی متفق ہو کر ان سے لڑو۔ اس ارشاد کی تفسیر وہ آیت ہے جو سورہ بقرہ رکوع ۲۴ میں آئی ہے، الشھر الحرام بالشھر الحرام الآیہ۔ [38] مفسرین کے ایک گروہ نے یہ گمان کیا ہے اور بعد میں موجودہ زمانہ کے بعض محققین نے بھی اس خیال پر زور دیا ہے کہ عرب میں نسی کا قاعدہ شمسی مہینوں کے ساتھ قمری مہینوں کو مطابق کرنے کے لیے جاری ہوا تھا اور اس غرض کے لیے وہ شمسی حساب کے مطابق قمری مہینوں میں ایک کبیسہ کا مہینہ بڑھا دیا کرتے تھے۔ لیکن عام مفسرین اور اہلِ روایت کا بیان یہ ہے کہ اہلِ عرب اپنی خواہشات کے مطابق کبھی کسی حرام مہینے کو حلال کر کے اس میں جنگ جاری رکھتے تھے اور اس کے بدلے کسی دوسرے مہینے کو حرام ٹھیرا دیا کرتے تھے تاکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حرام مہینوں کی تعداد پوری بھی ہو جائے اور ضابطے کی بندش سے ان کی خواہشات پر جو رکاوٹ عائد ہو گئی ہے وہ ٹوٹ بھی جائے۔ اسی کو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت کہا گیا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ تمام حیلے جن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قانونِ الٰہی کی بندش سے آزاد ہو کر اپنی خواہش پوری تو کر لی جائے لیکن ظاہر میں پابندیِ قانون کی شکل قائم رہے زیادۃ فی الکفر کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک گناہ تو یہ ہے کہ آدمی قانونِ الٰہی کی بندش توڑنا چاہتا ہے اور اس پر مزید کفر یہ ہے کہ بندش کو توڑنے کے باوجود ظاہر میں پابندیِ قانون کی شکل بنا کر خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو آج جن حیلوں کو شرعی حیلے کہا جاتا ہے ان سب کی نوعیت یہی ہے، اور غضب یہ ہے کہ علماءِ دین ان حیلوں کی تعلیم لوگوں کو دے رہے ہیں۔

مقالات

توحید کے دلائل انفس میں

از
جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائلِ آفاق کی بنیاد درحقیقت نفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کیلیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم بالکل ظلمات ہوتا۔ چنانچہ جو طبیعت آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے۔ اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ دل نشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی۔ جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی کیا تم نہیں دیکھتے؟

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالم نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہد فطرت توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ "حقیقت شرک" کی آخری دو فصلوں میں کی ہے۔ یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ وہاں ہم نے علمائے سائنس کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اس سے ان کی عبادات کا تصور پیدا ہوا۔ اور یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسباب زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے۔ نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے۔ اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گذاری کا جذبہ اور تصور پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ نہ تو الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی

کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک، جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گذاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں، عدل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے بھی ناپتا ہے۔ اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلاوجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں 'ظلم عظیم' یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم شرک۔ اس عدل کو قرآن نے فطرت انسانی کے عہد سے تعبیر کیا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ

اور یاد کرو جب لیا تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان کے اوپر، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ہم گواہ ہیں یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے حقیقت شرک کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے یہاں نقل کرتے ہیں:

"بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے؟ ہمیں تو نہ اس الست بربکم کی کوئی خبر ہے نہ اس بلیٰ کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جبکہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد ہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر، اور کتنے دکھ اٹھا کر، و مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر، ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں، اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جاں کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی خود پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجئے بچہ جوان ہو، اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں، اور وہ مستغنی۔ لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے یہ ذمہ داری (Responsibility) اور استحقاق (Privilege) کا وہ فطری عہد ہے جس

زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔"

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوجاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی، جان اور مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑجائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کردیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے۔ اس کے حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے۔ اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دیدے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے۔ اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کے جوکھم میں پڑنے کا اقرار نہیں کیا تھا تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاق غلیظ کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔"

"یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور عالمگیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے۔ ہمارے چمن میں اُگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں۔ اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کردیں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم اس کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر شام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لُو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کرسکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہوجاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

"اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت

کو وجود بخشا ہے۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدہ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان وقبیلہ کو وجود بخشا جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھکر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم بکری اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہے جس نے گائے اور گھوڑے، دشت وچمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکرگذاری کی جائے اور اس شکرگذاری میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھیرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ (۸۲-شعراء)

اور سناؤ ان کو ابراہیم کی سرگذشت، جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، یہ تم لوگ کس چیز کی پوجا کر رہے ہو؟ بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ کہا ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم پوجتے ہو، تم اور تمہارے اگلے بزرگ۔ یہ سب تو میرے دشمن ہیں مگر عالم کا رب جس نے مجھے پیدا کیا، پھر ہدایت بخشتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا پھر زندہ کرے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں۔ جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا۔ جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی۔ جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم وکرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں ہمارے ساتھ اچھا ہوگا۔ بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی نہایت اعلیٰ دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکرگذاری کی صورت میں ادا کریں اور اس عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھیرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

۲۔ علم ویقین کی فطری طلب انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم، اور حیرانی وسرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز وانجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو۔ وہ اپنی ہستی کی غایت، اور اس کے نیک وبد

سے بالکل بے خبر ہو۔ کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسرے کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے، اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کرلے اور اسی پر جم جائے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ ان سوالات سے سرے سے کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح جگہ نہ پاکر کسی غلط چیز ہی کو اختیار کر لیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جاسکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (آگاہ! صرف اللہ کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔ یہی وہ نور ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے)۔ اس کو پا لینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصور کر سکتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کر سکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا۔ اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اب اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک جاتی ہے لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا بدبختی کا انتہا ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بہ تکلف انسان نے اختیار کی ہے ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک 'لا الٰہ الا ہو' کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ اور انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے۔ الا آنکہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت و صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصلی مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام صفات کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بھی بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرت انسانی اس کے بغیر تسکین نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۱۱۶-۱۱۷ - مومنون)

پس بادشاہ حقیقی بلند و برتر ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، باعظمت عرش کا مالک۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کا ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیونکہ مشرک ایک خدا کو تو بہر حال مانتا ہی ہے۔ یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے۔ باقی رہے شرکاء و انداد جو اس نے فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے لیے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے لیے دلائل کی۔ ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳۔ فطرت انسانی کا علو توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرت انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہشمند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساس برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی و برتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ الآیۃ میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے۔ کبھی أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ پکار اٹھتا ہے۔ کبھی أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساس برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں، بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آکر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو، جو کسی کے آگے جھکنا نہیں جانتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قوتوں اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس

میں بالطبع کمتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے۔ اس میں اصلی ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچائے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرت کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبر نفس اور علو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعتراف حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے جو مدعی تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں اسی لیے میں ہی رب ہوں"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ "اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کر دو"۔ اس کے عجز کو بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضے سے بھکا بکا ہو کے رہ گیا لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و قدیر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں۔ اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود در در صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دناءت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل و بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے۔ جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزت نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ ایک چھنال عورت ہے جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدائی کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا کو ملنے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پُر ہو گیا اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کے الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمہیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو۔ مجھے اس سے معاف رکھو۔

وللناس اشجان ولی شجن وحدی   تحمل اصحابی ولم یجدوا وجدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں اشارہ فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قیدخانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَاكَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ۔

اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی۔ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھیرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰-۳۹ یوسف)	اے میرے قید خانہ کے ساتھیو، کیا بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک ہی اللہ جو سب کو دبا کر رکھنے والا ہے۔ نہیں تم پوجتے ہو اس کے سوا مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی فطری دین ہے لیکن اکثر نہیں جانتے۔

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی روح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا۔ اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت وعزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنے نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے۔ اور انسان اپنے نفس کے علو کے باوجود اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے مانے بغیر اس کی فطرت کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد قہار کی اطاعت کی جائے؟ ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اُسی ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے۔ لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اس علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹-زمر)	اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے۔ کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ شکر ہے اللہ کے لیے۔ بلکہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کرتا ہے۔ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد فطرت انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمد للہ۔ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

انسان کے اسی علو فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹-زمر)	کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ہے۔

یہی علو نفس ہے جس کو ایک انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعۃً رفعت وعزت کے اس آسمان سے جس پر

اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے۔ انتہائی ذلت کی حضیض میں گرجاتا ہے۔ ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق۔ اور دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ وَمَنْ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۱۸ - الحج)	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے انسانوں میں سے بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب واجب ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے تو ان کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گذاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴. انسان کا ضعف و افتقار چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے۔ ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے۔ فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں سے کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اس کے بنائے ہوئے قانون طبیعی کی بھی پابند ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو دیکھے اور پھر ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے۔ یہ تمتع بھی بس ایک مدت تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ انتم الفقراء الی اللہ اور دوسری جگہ فرمایا ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤد، حضرت سلیمان، ذوالقرنین اور فاروق اعظم ہیں لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم و حشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بےخود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور ابولہبوں کے

اور ضلالت ہیں۔ جن لوگوں پر اس طرح خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی و ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں۔ اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی اصلی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکا، خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکا و انداد سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہے جس کا دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ (۶۳-۶۴ انعام)

پوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو رہائی دی اس آفت سے تو ہم شکر گزاروں میں سے بنیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی ہے جو تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم اس کا ساجھی ٹھہراتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲۲-۲۳ یونس)

وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں۔ یہاں تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر ساز گار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں تند ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف سے گھیرے ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے پس جب ان کو نجات دیدی دفعۃً وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی حق کے۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی کتنی سچی مثال ہے! دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسن انتظام پر مغرور ہوتا ہے۔ اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے سرو سامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکر گذاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے لیکن جب دفعۃً ساز گار ہوا طوفانی ہو جاتی ہے، کشتی ڈانواڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرکاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا۔ بلکہ تیرا شکر گذار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا۔ نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے، پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سرو سامان اور جس گھمنڈ کو اس نے ابھی ابھی بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا نے ختّار اور کفور، عہد شکن اور ناشکرا کہا ہے کیونکہ فطرت

کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفران نعمت کی حالت اختیار کرلیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے امن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خودسری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پاکر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریب اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو اِنما اوتیتہ علیٰ علم (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے، جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بےبسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

(جو اس وقت موجود ہیں)

رسالۂ دینیات	عمر	تجدید و احیائے دین	عہ	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول عمر حصہ دوم عہ حصہ سوم عہ			
مسئلۂ قومیت	عمر	تنقیحات	عہ	پردہ	عہ	روداد جماعت اسلامی حصہ اول سہ حصہ دوم ۹ر	
حقوق زوجین	عمر	حقیقت شرک	عمر	ذہنی زلزلے	عہ	سلامتی کا راستہ	۹ر
اسلام اور جاہلیت	۶ر	دین حق	۶ر	اسلام کا نظریہ سیاسی	۶ر	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۹ر
جہاد فی سبیل اللہ	۶ر	راہ عمل	۶ر	نشان راہ	۶ر	اسلام کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر
نیا نظام تعلیم	۶ر	خدا کی اطاعت کس لیے؟	۶ر	خطبۂ تقسیم اسناد	۲ر	مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع	۲ر
ایک اہم استفتاء	۲ر	نیشنلزم اینڈ انڈیا	۹ر	مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر	عہ		
تفسیر سورہ قیامہ	۸ر	دستور جماعت اسلامی	۲ر	قرآن اور پیغمبر	۵ر	مسلمان کا بنیادی عقیدہ (انگلش)	۲ر
عبادت	۲ر	ایمان کی کسوٹی	۲ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر	لا الٰہ کے معنی	۲ر
دینیات (انگریزی)	عہ	اسلام کیا ہے؟ (انگریزی)	عہ	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (انگریزی)	۹ر		

(زیر طبع مطبوعات)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر — قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

عبادت اور عبودیت

(۳)

از افادات امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

(مترجمہ مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

عبدیت کے لحاظ سے لوگوں میں فرقِ مراتب

جب تم پر عبادت کی یہ حقیقت روشن ہو چکی تو ایک نگاہ میں تمہیں یہ بھی بدیہی طور پر محسوس ہو جانا چاہیے کہ اس صفت مطلوب کے حصول میں لوگوں کے درمیان عظیم الشان فرق موجود ہے، اور یہ فرق دراصل ایمان کے فرقِ مراتب کا مظہر یا اس کا دوسرا نام ہے۔ عبودیت کے مقامات اور صفاتِ کمال کے لحاظ سے لوگ دو گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ ایک خواص کا گروہ دوسرا عوام کا گروہ۔ اور اسی بنا پر پروردگارِ عالم کی ربوبیت کا تعلق بھی تمام لوگوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتا بلکہ لازمی طور پر اس میں بھی تنوع اور عموم و خصوص پایا جانا ضروری ہے۔ بلکہ حد یہ ہے کہ توحیدِ خالص اور عبودیتِ حقیقی کی علمبردار امت بھی شرکِ خفی کے باریک ترین جراثیم سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

تعس عبد الدرھم تعس عبد الدینار تعس عبد القطیفۃ تعس عبد الخمیصۃ تعس وانتکس واذا شیک فلا انتقش اذا اعطی رضی واذا منع سخط۔

ہلاک ہو بندۂ درہم، ہلاک ہو بندۂ دینار، برباد ہو نرم کمبل کا غلام، تباہ ہو ریشمی چادر کا بندہ، ہلاک ہو وہ اور اوندھے منہ گرا۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو نکلتا نہیں (یعنی مصیبت پر مبتلا اٹھتا ہے) اور جب اسے کچھ دیا جائے تو خوش ہو جاتا ہے اور اگر محروم کر دیا جائے تو سخت بیزار۔

ترجمانِ حقیقت کے ان الفاظ پر غور کرو کہ آپ کس طرح زخارفِ دنیوی کے پیچھے پڑنے والے کو عبد الدرہم اور عبد الدینار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں اور دعائے بد کے طور پر چند کلمات ارشاد فرماتے ہیں تو ساتھ ہی چند الفاظ میں ایک تشبیہی اسلوبِ بلیغ کے ساتھ اس کی زرپرست فطرت کا مرقع کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی خوشی اور ناخوشی کا مدار حصولِ مال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید بھی انسانی فطرت کی اس کمزوری پر شہادت دیتا ہے۔

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ

(توبہ - ۷)

ان منافقوں میں سے بعض صدقات کی تقسیم کے بارے میں تجھ پر معترضانہ اشارے کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انہیں کچھ دیا جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر کچھ ان کو نہ دیا جائے تو یکایک جل اٹھتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ان کا خوش ہونا یا ناخوش ہونا اللہ کو چھوڑ کر کسی اور ہی چیز پر منحصر ہے۔ ان لوگوں کا مدارِ رضامندی اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ ان کی اپنی خواہش اور دنیوی لذتیں ہیں، حالانکہ ایک بندہ کی عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی رضا و عدمِ رضا کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دے۔ ورنہ وہ عبدیت کے ادعا کے باوجود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ وہ زبان سے خدا کا بندہ ہے مگر دل مال کی بندگی کے نیاز سے خالی نہیں۔

یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو کسی ریاست یا کسی حسین صورت یا اسی نوع کی کسی اور ہوائے نفس پر مفتون ہو۔ وہ بھی مال و زر کے پجاری کی طرح اگر اپنی مطلوبہ چیز کو پاتا ہے تو سکون و مسرت میں سرمست ہو جاتا ہے، اور اگر ناکام تمنا رہ گیا تو اسی کے غم میں گھلتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر مذکورہ بالا شخص حسب ارشاد نبوی بندۂ سیم و زر ہے تو یہ بھی اپنی محبوبہ کا بندہ اور غلام ٹھیرا۔ کیونکہ بندگی اور غلامی درحقیقت دل کی بندگی و غلامی ہے۔ جو چیز بھی قلب کو اپنا غلام اور اسیر بنالے، انسان صحیح معنوں میں اسی کا بندہ اور غلام ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے کتنی درخشاں حقیقت کا اظہار کیا جس نے کہا ؎

العبد حر ما قنع والحر عبد ما طمع

غلام قانع ہے تو آزاد ہے اور آزاد طامع ہے تو غلام ہے

یہی بات ایک اور شاعر ان لفظوں میں کہتا ہے ؎

اطعت مطامعی فاستعبدتنی ولو انی قنعت لکنت حرا

میں نے اپنی آرزوؤں کی اطاعت کی اور انھوں نے مجھے اپنا غلام بنالیا، اگر میں قناعت اختیار کرتا تو یقیناً آزاد رہتا۔

اہل دانش کہا کرتے ہیں کہ طمع گلے کا طوق ہے اور پاؤں کی بیڑی۔ گلے کو طوق سے آزاد کرتے ہی پاؤں کی بیڑی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "لوگو سن لو کہ طمع فقر ہے اور ناامیدی غنا، جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے" (مشکوٰۃ)۔ اور یہ ایک امر واقعہ ہے جس کی ناقابل انکار شہادت ہر انسان خود اپنے ہی اندر محسوس کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی جبلت ہی یہ ہے کہ جس شے سے وہ ناامید ہو جاتا ہے اس کی طلب اور لالچ اپنے دل سے نکال دیتا ہے، پھر تو وہ اس کی طرف نگاہ احتیاج اٹھاتا ہے نہ ہی اس سلسلہ میں کسی معین و مددگار کی طرف۔ بخلاف اس کے، اگر وہ کسی معاملہ میں پرامید ہوتا ہے اور اس کا دل اس سے اٹکا ہوا رہتا ہے تو وہ اس کا بھی دیوانہ اور محتاج بنا رہتا ہے، اور ان لوگوں کا بھی جن کے متعلق اس کو گمان ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کے حاصل کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔

فطرت انسانی کا یہ ایک عام اصول ہے۔ مال و زر، جاہ و دبدبہ، حسن و جمال، غرض جس شے کو بھی لو، ہر ایک کی تمنا میں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا۔ خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے کہ:۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (عنکبوت۔ ۲)	اللہ ہی کے پاس اپنا رزق تلاش کرو، اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرتے رہو۔

رزق کے بغیر تو کوئی چارۂ کار نہیں، ہر انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ کہیں نہ کہیں سے اس کو حاصل ہی کرنا پڑے گا، سو ایک شخص اللہ سے اپنا رزق مانگتا ہے تو وہ اللہ کا بندہ ہوگا، اور اسی کا محتاج اور اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے طلب رزق کرتا ہے تو در اصل اس مخلوق کا عبد ٹھیرا اور اسی کا حاجتمند۔

سوال کرنے کی ممانعت یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی مخلوق سے کچھ مانگنا، اصولاً حرام اور ممنوع ہے اور محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ گدائی کی ممانعت میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) "جو لوگوں سے مانگتا رہے گا قیامت کے دن وہ اسی حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ گوشت سے بالکل خالی ہوگا (یعنی نہایت ذلت و رسوائی

کے عالم میں) (بخاری و مسلم)

(۲) "جس شخص نے غنی ہونے کے باوجود (یعنی اپنے لیے سامانِ زیست رکھتے ہوئے) سوال کا ہاتھ اٹھایا، قیامت کے دن یہ سوال اس کے چہرے میں زخم کے گڑھے یا ہلکے یا اوچھے نشانات بن کر ظاہر ہوگا" (یعنی سائل کے حالات اور کیفیت سوال کے لحاظ سے نشانہائے زخم زیادہ یا کم گہرے ہوں گے۔ اور ساری مخلوق کے سامنے اسے رسوا کریں گے) (ترمذی)

(۳) "سوال کرنا حرام ہے سوائے تین شخصوں کے۔ ایک تو وہ مقروض جو قرض کے بوجھ کے نیچے بری طرح پس رہا ہو، دوسرا وہ فقیر جس کو فقر و فاقہ کی شدت نے فرشِ خاک پر ڈال دیا ہو، تیسرا وہ خونی ملزم جس پر دیت کا بار ہمت شکن ہو رہا ہو" (ابوداؤد)

(۴) "قسم خدا کی، اگر تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر لائے اور بیچے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کی عزت نفس کو گداگری سے محفوظ رکھے، تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور لوگ بھی ہیں آئے دیں یا نہ دیں۔" (بخاری)

(۵) "جو سوال سے بچتا ہے اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے، جو عفت اختیار کرتا ہے اللہ اس کو عفیف بناتا ہے اور جو مصیبت پر صبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صابر بنا دیتا ہے۔ کسی شخص کو کوئی نعمت ایسی نہیں بخشی گئی جو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع ہو" (بخاری ومسلم)

(۶) "اس مال (خزانۂ بیت المال) میں سے اگر کچھ تمھیں ملے، اور تمھارا حال یہ ہو کہ نہ تو تم نے اس کو زبان سے مانگا ہو نہ ہی تمھارا دل اس کی طرف مائل ہو تو اس مال کو لے لو۔ اگر یہ صورتِ حال نہ ہو تو پھر اپنے نفس کو ایسے مال سے دور ہی رکھو۔"

گویا فی نفسہٖ اس مال میں کوئی پہلو کراہت کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق لینے والے کی نفسیات سے ہے۔ اگر دل اس کی حرص اور تمنا سے خالی ہے تو پھر چنداں مضائقہ نہیں، کہ یہاں اس کی عبدیت کا جوہر بالکل محفوظ بچا رہتا ہے، اور اگر زبان سے سوال کر بیٹھا یا قلب کے کسی عمیق ترین گوشہ میں بھی اس مال کی خواہش دبی ہوئی ہے تو پھر ایک مومن کو ایسے مال کو ہاتھ لگانا روا نہیں کیونکہ یہاں اس کے جوہرِ عبدیت کی پامالی کا اندیشہ ہے۔

کبار صحابہ کو سوال کی قطعی ممانعت اوپر یہ تصریح گزر چکی ہے کہ اسلام کا مزاج سوال کرنے کو کبھی گوارا نہیں کرتا مگر بربنائے ضرورت مخصوص مجبوریوں کے موقع پر اس کی رخصت دی گئی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام نے اپنے خاص صحابہ کو اس رخصت سے بھی منع فرما دیا اور انھیں عزیمت کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے ہوئے حکم دیا کہ کسی مخلوق سے کبھی کوئی سوال نہ کریں۔ چنانچہ مسند میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ ذرا اسے اٹھا دینا اور فرماتے کہ میرے دوست نے مجھے حکم دیا ہے کہ انسانوں سے کوئی سوال نہ کروں۔" صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کے ساتھ نجد سے بیعت لی اور ہم سب کے کانوں میں آہستہ سے یہ بات ڈال دی کہ کسی سے کبھی کوئی سوال نہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا چھوٹ کر گر پڑتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتا کہ اسے اٹھا کر مجھے دو۔

خدا ہی سے سوال کرنے کا حکم ہے ایک دو نہیں بلکہ متعدد نصوص کتاب اور سنت میں موجود ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ مانگنا ہو رزاقِ حقیقی سے مانگو، کسی مخلوق کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۔ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (الم نشرح) پس جب تم فارغ ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب ہی سے التجا کرو۔

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء۔ ۵) اور اللہ سے اس کا فضل (رزق) مانگتے رہو۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (عنکبوت۔ ۲) اللہ ہی کے ہاں اپنا رزق چاہو۔

یہ آخری فقرہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ارشاد ہے۔ اس کے الفاظ کو دیکھو فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ فرمایا، فَابْتَغُوا الرِّزْقَ عِنْدَ اللّٰهِ

نہیں کہا۔ کیونکہ عند اللہ کے الفاظ کو مقدم کر کے حصر اور اختصاص کا پہلو نمایاں کرنا مد نظر تھا گویا یوں فرمایا کہ رزق کسی غیر خدا کے یہاں مت تلاش کرو، بلکہ صرف خدا ہی کے دربار سے اس کو مانگو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس رضؓ کو نصیحت فرماتے ہیں:۔

"اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، اگر مدد چاہتے ہو تو اللہ سے چاہو۔"

ہر انسان بتقاضائے بشری دو چیزوں کا حاجتمند ہوتا ہے، ایک تو رزق وغیرہ ضروریات زندگی، دوسری حفاظت نفس اور دفع مضرت۔ ان دونوں امور میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے لیے انسان جب پکارے تو اللہ ہی کو پکارے۔ ضرورت کے وقت اسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور مصیبت کے موقع پر اسی سے فریاد کرے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام کا اسوہ ہمارے سامنے ہے کہ بیٹے کے غم کی شدت جب برداشت نہ ہو سکی اور وفور اضطراب میں لبہائے مبارک بے اختیار متحرک ہونے لگے تو ان سے جو صدا نکلی وہ یہ تھی کہ:۔

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ (یوسف) میں اپنی پریشانی اور رنج و غم کا گلہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے "ہجر جمیل" کو بطور اخلاق کریمہ کے ذکر فرمایا ہے۔ علما نے ان الفاظ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ "ہجر جمیل" کے معنی ہیں کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر خاموشی کے ساتھ اس سے الگ ہو جانا۔ اور "صفح جمیل" کے معنی ہیں پیشانی پر آثار عتاب لائے بغیر کسی کو معاف کر دینا اور "صبر جمیل" کے معنی ہیں زبان پر کسی مخلوق کے سامنے حرف شکایت لائے بغیر صبر کر جانا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کو حالت مرض میں جب یہ سنایا گیا کہ امام طاؤس رحؒ مریض کے کراہنے کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ شکوہ مخلوق ہے تو امام موصوف نے کراہنا موقوف کر دیا اور پھر اس کے بعد مرتے دم تک ان کے منہ سے آہ کا لفظ نہ سنا گیا۔

رہ گیا مصائب کے وقت حضرت باری تعالیٰ میں عرض شکایت کرنا، سو یہ صبر جمیل کے منافی نہیں، جس کی شہادت حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ سے ملتی ہے کہ ایک طرف آپ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ فرماتے ہیں اور ساتھ ہی اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ بھی کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز فجر میں سورہ یونس، یوسف اور نحل کی قرأت کرتے ہیں اور جب اس آیت (انما اشکوا الخ) پر پہنچتے ہیں تو رو پڑتے ہیں اور رونے کی آواز آخری صفوں تک سنائی دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"خدایا! حمد کا کلی استحقاق تجھی کو ہے، تو ہی ہماری شکایتوں کا مرجع ہے، تو ہی ہمارا سہارا ہے اور تو ہی ہمارا فریاد رس، تیرا ہی بھروسہ ہے اور جو قوت اور توانائی ہمیں ملتی ہے تیری جناب سے۔"

طائف کے اشقیا نے جب رحمۃ للعالمین کے ساتھ اپنی مشہور اور رسوائے عالم درندگی کا مظاہرہ کیا تو زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے:۔

"اے اللہ! میں اپنی ناتوانی، اپنی بے چارگی اور اپنی کس مپرسی کا تجھی سے گلہ کرتا ہوں، تو ہی ناتوانوں کا پروردگار ہے، اور تو ہی میرا پروردگار، الخ"

ان واقعات اور تفصیلات کی روشنی میں یہ حقیقت کسی بحث و تمحیص کی محتاج نہیں رہ جاتی کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی شکایتوں کو پیش کرنا اور اپنی مصیبتوں کے متعلق عرض و معروض کرنا ممنوع اور مذموم نہیں بلکہ مامور اور محمود ہے اور جو بندہ اپنی حاجت براری کے لیے اللہ کے فضل و کرم

کا جتنا ہی زیادہ حریص ہوگا اس کی عبدیت اتنی ہی زیادہ پختہ اور خالص، اور ماسوا سے اس کی بے نیازی اتنی ہی زیادہ محکم اور کامل ہوگی۔ جس طرح کسی مخلوق کی حرص اور رغبت اس کی عبودیت کی موجب، اور اس سے مایوسی اور بے رغبتی اس سے قلب کی بے نیازی کی باعث ہوتی ہے، اسی طرح خالق و رازق حقیقی کی نعمتوں اور نعمتوں کی حرص و رغبت اس کی عبودیت کی موجب ہے اور قلب انسانی کا اس کی طلب و احتیاج سے اعراض کرنا اس کی عبودیت سے اعراض کرنے کے مرادف ہے۔ یہ خطرہ ان لوگوں کے حق میں تو بہت زیادہ شدید ہے جو خالق کی طرف سے اپنی طلب و رجا کا رشتہ توڑ کر کسی مخلوق سے اس طرح جوڑ لیں کہ اسی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیں اور اسی پر اپنے اعتماد قلب کی عمارت تعمیر کر لیں مثلاً کوئی اپنی ریاست، اپنی حکومت، اپنی فوج اور اپنے خدم و حشم پر اعتماد کر بیٹھے یا کوئی اپنے اہل و عیال اور احباب و اقارب پر، یا اپنے ذخائر دولت پر اور خزائن سیم و زر کو اپنا مرجع التفات بنا لے، یا اپنے کسی آقا، کسی فرمانروا، کسی مخدوم، کسی پیر، کسی مرشد اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں کو، جو فنا ہو چکے ہوں یا جن کا فنا ہونا بہرحال یقینی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نصیحت اپنے ہر بندہ کے لیے یہ ہے کہ:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ	اس اللہ پر بھروسہ کر جو زندہ جاوید ہے جس کو کبھی فنا نہیں، اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی
وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (فرقان - ۵)	پاکی بیان کر، اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے کسی غیر کا ضرورتمند نہیں

اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس شخص کا دل بھی مخلوقات کی طرف اس توقع کے ساتھ مائل ہوگا کہ وہ اس کے کسی اڑے وقت میں کام دیں گی یا اسے روزی مہیا کریں گی یا اس کو راستی اور ہدایت عطا کریں گی، یقیناً اس کے دل میں ان کی عظمت پیدا ہوگی اور وہ ان کے سامنے عاجزانہ جھکا ہوا ہوگا اور انجام کار اسی اعتقاد اور اسی تذلل کے تناسب سے اس کے اندر ان کی عبدیت اور بندگی بھی ضرور پیدا ہو جائے گی اگرچہ بظاہر وہ ان کا امیر اور سردار اور آقا و فرمانروا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ حکیم کی نگاہ تو ظواہر پر نہیں ہوتی، حقائق پر ہوتی ہے۔

حُبّ غیر بندگی غیر چنانچہ جب کوئی شخص کسی عورت کے حسن و جمال سے متاثر ہو جاتا ہے تو، خواہ وہ عورت شرعاً اس کے لیے مباح ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل اس کا اسیر محض بنکر رہ جاتا ہے اور وہ جس طرح چاہتی ہے اس کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہتی ہے، حالانکہ ظاہر میں وہ اس کا آقا اور سردار ہوتا ہے کیونکہ اس کا شوہر ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کا محکوم اور مملوک ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت، جبکہ اس عورت کو بھی اس کے نیاز عشق اور فریفتگی شوق کا علم ہو جائے اور اسے یقین ہو جائے کہ کسی حال میں بھی اس کی مفارقت اس کو گوارا نہیں ہو سکتی اور خواہ کچھ ہی ہو جائے لیکن اس کو چھوڑنے اور کسی دوسری عورت سے رفاقت زندگی کا رشتہ جوڑنے کا تصور بھی اس کے لیے جانکاہ ہے۔ پھر تو وہ اس پر اس طرح آمرانہ حکومت کرتی ہے جس طرح کوئی ظالم اور قاہر آقا اپنے زرخرید اور مجبور محض غلام پر، بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی اور مطلق العنانی کے ساتھ۔ کیونکہ روح کی قید، جسم کی قید سے، اور روح کی غلامی، جسم کی غلامی سے کہیں زیادہ مستحکم ہوتی ہے، جس انسان کا بدن قید و بند غلامی میں ہو لیکن دل اس قید کے اثرات سے آزاد اور محفوظ رہے تو اس کو اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس قید سے رہائی کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سلطنت جسم کے بادشاہ ــــ قلب ــــ پر یہ آفت آجاتی ہے اور وہ کسی غیر اللہ کے دام قید یا حلقۂ غلامی میں جا پھنستا ہے تو پھر اس کی غلامی حقیقی غلامی ہوتی ہے اور یہ غلامی دراصل تذلل اور عبودیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اور قلب کی بندگی اور محکومی ہی وہ شے ہے جس پر ثواب اور عذاب کا ترتب ہوتا ہے۔ چنانچہ تمہیں معلوم ہوگا کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی کافر ظلماً قید کرے اور کوئی فاسق اس کو زبردستی غلام بنا لے تو یہ چیز اس کے دین و ایمان کے حق میں کچھ بھی مضرت رساں نہیں بشرطیکہ اس قید اور غلامی میں بھی اپنی مقدرت کے مطابق وہ واجبات دینی ادا کرتا رہے۔ اسی طرح اگر مسلمان واقعتہً کسی کا غلام ہے اور وہ اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا رہتا ہے اور اپنے دنیوی آقا کے حقوق بھی، تو اس کے لیے اللہ کے ہاں دُہرا اجر ہے۔ حدیث ہے کہ اگر کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں میں پڑ کر

کلمۂ کفر کہنے پر مجبور ہو جائے لیکن دل میں ایمان کا اقرار موجود ہو تو یہ ظاہری اقرار کفر اس کی سلامتی پر یک سر مُو بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس کے جس کا دل ہی کسی غیر مخلوق کا غلام بن جائے تو یہ اس کے ایمان کے لیے تباہ کن ہے۔ خواہ ظاہر میں وہ ایک سلطنت کا حکمراں ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ حریت اور عبودیت کا انحصار قلب پر ہے نہ کہ جسم پر۔ جس طرح کہ تونگری کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ مال سے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غنا اور تونگری کا انحصار مال و دولت کی فراوانی پر نہیں ہے بلکہ دل پر ہے اور اصل تونگری دل کی تونگری ہے۔"

یاد رہے کہ یہ نتیجہ تو اس عشق کی نیازمندیوں کا ہے جو شرعی طور پر کسی مباح صورت سے تعلق رکھتا ہو، اور اگر کہیں بدقسمتی سے کسی کا دل کسی خوبصورت یا کسی حسین لڑکے کی محبت میں غرق ہو گیا ہو اور وہ اس کے عشق کے آستانہ پر اپنی متاعِ قلب نثار کر دے تو پھر یہ وہ سراپا عذاب ہے جس کے اندر کسی خیر اور ثواب کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص ان بدبختوں میں ہے جو رحمتِ الٰہی سے سب سے زیادہ دور اور عذابِ خداوندی سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ کسی حسین صورت کا عاشق جب تک اس حسین صورت کے تصور میں ڈوبا ہوا اور اس کا پرستار رہتا ہے، اس وقت تک وہ اور اس کے دل و دماغ، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے بے شمار مفاسد اور خبائث کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اس سلسلہ میں فاحشۂ کبریٰ کے ارتکاب سے بچا بھی رہے تو بھی صورتِ محبوب کے تصور میں اس کے قلب کا دائمی انہماک، بلا ارتکابِ فاحشہ بھی، اس کے حق میں اس امر سے زیادہ ضرر ناک ہے کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ کر ڈالے اور پھر اس سے اس طرح تائب ہو جائے کہ قلب اس گناہ کے اثرات سے بالکل پاک ہو جائے۔ ایسے بوالہوسوں اور عاشقوں کا حال تو مستوں اور مجنونوں کا سا ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر، کہ مجنون کو تو کبھی ہوش بھی آ جاتا ہے مگر انہیں اپنے خمارِ عشق سے ایک لمحہ بھی رہائی نصیب نہیں ہوتی۔

غیر اللہ میں انہماک اور خدا سے تغافل

اس آفتِ روحانی کے سلسلہ کی سب سے بڑی اور آخری بدبختی یہ ہے کہ قلب اللہ کے ذکر اور فکر سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور حلاوتِ ایمانی کے احساس سے بالکل محروم۔ مگر انسان کا دل اخلاصِ ایمانی اور عبادتِ الٰہی کی لذت آشنا ہو تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے بھی اس سے شیریں تر، لذیذ تر اور مرغوب تر نہیں رہ جاتی کہ اس کی طرف وہ والہانہ رغبت کے ساتھ متوجہ ہو سکے کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی محبوب چیز کو اسی وقت چھوڑتا ہے جب اس کو کوئی اس سے زیادہ محبوب چیز میسر آ جائے یا یہ کہ کسی بڑے نقصان اور مصیبت کا اس کو خوف ہو۔ پس حُبِّ فاسد سے قلبِ انسانی کو یا تو عشقِ صالح آزاد کرا سکتا ہے یا کوئی بڑا اندیشۂ زیاں۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے رازِ عفت کے متعلق فرماتا ہے:۔

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (یوسف - ۳) — ایسا ہوا تاکہ ہم یوسف کو برائی اور بے حیائی سے بچالیں۔ یقیناً وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قلبِ مومن کو مبتلائے "سوء" ہونے سے ـــــ یعنی حسنِ انسانی کی طرف کسی غیر مناسب طریقہ پر مائل ہونے اور اس کے دام میں گرفتار ہونے سے ـــــ بچاتا ہے اور اس کے اخلاصِ ایمانی کے صدقہ میں "فحشاء" سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک انسان حقیقی ذوقِ اخلاص اور سچی لذتِ عبودیت سے شاد کام نہیں ہوتا اس کا نفس اسے اپنی خواہشات کی چاکری میں لگائے رہتا ہے اور وہ اس کے سامنے بے بس بنا رہتا ہے مگر جب وہ ایک بار اخلاص کا لذت شناس ہو لیتا ہے اور اس کی قوتیں دل میں راسخ ہو جاتی ہیں تو بغیر کسی کشاکش کے خواہشاتِ نفس اس کے آگے ہتھیار ٹیک دیتی ہیں۔ قرآن کے بیان کردہ فلسفۂ نماز میں ہمیں یہی اصول ملتا ہے:۔

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ — بلاشبہ نماز بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد سب سے بڑی

اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت - ۵) | چیز ہے (جو نماز سے حاصل ہوتی ہے)

یعنی نماز کی افادیت کے دو پہلو ہیں، ایک تو مکروہاتِ فطری ـــ یعنی فحشا اور منکر ـــ کا استیصال، دوسرے ایک شئے محبوب یعنی یادِ الٰہی کا حصول۔ باعتبار مقصد دوسرا پہلو پہلے سے اہم اور افضل ہے کیونکہ اللہ جل شانہٗ کی یاد اور اس کی عبادت ہی مقصود بالذات ہے اور مکروہات کا اندفاع اس راہ کی ایک ناگزیر منزل اور اس کے حصول کا زینہ ہے، اس لیے اس کی حیثیت ثانوی اور تبعی ہوئی۔ قلبِ انسانی ایک ایسی مخلوق ہے جو طبعاً حق پسند اور حق طلب واقع ہوئی ہے، اس لیے جب برائی کا تصور اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اسے دور دھکیلنے کی سعی کرتا ہے کیونکہ برائیاں اور برے خیالات اس کو اس طرح تباہ اور برباد کر دیتے ہیں جس طرح خود رو گھاس پات زراعت کو۔ یہی حقیقت ہے جو ذیل کی آیات میں ہمیں ذہن نشین کرائی گئی ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (والشمس)
بامراد ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو آلودہ کیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (سبح اسم)
اس نے فلاح پائی جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے پروردگار کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (نور - ۴)
مومنوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریق کار ان کے لیے سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (نور - ۳)
اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔

دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے "غضِ بصر" اور "حفظِ فروج" کو نفس کے لیے "ازکیٰ" یعنی پاکیزہ قرار دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ ترکِ فواحش پاکیِ نفس کا ایک بنیادی جز ہے۔ اور پاکیِ نفس ایسا جامع لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس تمام برائیوں سے ـــ مثلاً فواحش، مظالم، جھوٹ اور شرک وغیرہ سے پاک اور بے لوث ہو جائے۔

یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو کسی حکومت کا طالب ہوتا ہے اور زمین پر اپنی فرمانروائی اور سرداری اور کبریائی کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ اندر سے دیکھو تو وہ بھی اپنے معینوں اور مددگاروں کا غلام نظر آئے گا اگرچہ ظاہر میں وہ ان کا رئیس اور مطاع دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنے اوپر آقائی اور حکمرانی اور آمریت کی جو نقاب ڈال رکھی ہے اس کے نیچے دراصل وہ دل ہے جو اپنے اتباع اور اعوان و انصار کے خوف و رجا سے لبریز ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھولے رکھتا ہے، بڑی بڑی جاگیریں بخشتا رہتا ہے اور ان کی کتنی ہی لغزشیں دیکھتا ہے مگر چشم پوشی کر جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے تاکہ وہ اس کی اطاعت اور اعانت کے لیے تیار رہیں، اور اس کے حسبِ منشا جدوجہد کرنے سے دریغ نہ کریں، ورنہ لیلائے حکومت کی تمنا حسرت ہی بن کر رہ جائے گی۔ پس ظاہر میں وہ ان کا آقا اور مطاع ہے پر حقیقت میں وہ خود ہی ان کا مطیع اور غلام ہے۔

لیکن ذرا اور گہری نظر سے دیکھو تو محسوس ہوگا کہ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہیں اور ہر ایک کے اندر دوسرے کی عبودیت موجود ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کا اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے۔ اس لیے یہ سب کے سب عبادتِ الٰہی کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ اور اگر ان دونوں کا مذکورہ تعاون، خدا کی زمین پر ظالمانہ طور پر علو اور تمکن حاصل کرنے کے لیے ہو تو ان کی حیثیت ان دو بدباطنوں کی سی ہو جاتی ہے جو کسی بدمعاشی یا رہزنی میں ایک دوسرے کی امداد کریں۔ الغرض ہوائے نفسی اور اغراضِ نفسانی ہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس فرمانروا کو

اپنے نام کے فرمانبرداروں کا، اور ان فرمانبرداروں کو اس نام نہاد فرمانروا کا عبد اور غلام بنا رکھا ہے۔

مال و دولت کا حریص بھی اسی صورت حال کا اسیر ہوتا ہے۔ اگر عاشقِ صورت، حسن صورت کا، اور طالب ریاست اپنے سپاہیوں اور سپہ سالاروں کا پرستار ہے تو یہ اپنی زندگی مال و زر کی عبودیت اور پرستش میں نذر کرتا ہے۔

اشیاء مادی کی دو قسمیں اس تنقیح سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ امور مادی اور اشیائے دنیوی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کی احتیاج انسان فطری طور پر رکھتا ہے مثلاً کھانا، پانی، لباس، مکان، بیوی وغیرہ، سو ان چیزوں کے حصول میں بندۂ مومن کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں اللہ ہی سے مانگتا ہے اور ان کے لیے اللہ ہی کے حضور رجوع کرتا ہے۔ اور وہ مال و اسباب جن سے وہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کام لیتا ہے، ان کی حیثیت اس کے نزدیک اس گھوڑے یا گدھے سے جس پر وہ سوار ہوا کرتا ہے، یا اس فرش سے جس پر وہ بیٹھا کرتا ہے، بلکہ اس قدمچہ سے بھی، جس پر وہ بیٹھ کر رفع حاجت کرتا ہے، زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اسباب زندگی اس کو ایسا گرویدہ نہیں بنا لیتے کہ وہ بس انھیں کا ہو رہے اور اس پر اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا کی کیفیت طاری ہو جائے۔

دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کی ضرورت، انسانی زندگی کے لیے فطری نہیں۔ ایسی چیزوں کی فکر اور تمنا میں سرگرداں ہونا ایک بندۂ خدا کا شیوہ نہیں۔ اور اگر ان چیزوں سے وہ دلی وابستگی پیدا کرے گا تو یقیناً وہ اس کو اپنا غلام بنا لیں گی اور بسا اوقات ایسا ہوگا کہ وہ ان کے لیے غیر اللہ پر اعتماد کرنے لگے گا، جس کے بعد قلب میں حقیقی عبودیت اور توکل علی اللہ کا وجود ایک امر ناممکن ہے، بلکہ صاف صاف یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اندر غیر اللہ کی عبدیت اور غیر اللہ پر توکل، اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا آدمی ارشادِ نبوی تعس عبد الدرہم الخ کا اولین مصداق ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ انھیں درہم و دنانیر اور دوسرے زخرفات دنیوی کا بندہ ہو رہتا ہے خواہ وہ ان چیزوں کو اللہ ہی سے کیوں نہ مانگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے باوجود وہ اس کے فیصلوں پر صابر اور شاکر نہیں رہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی سعی کر دے تب تو خوش، اور اگر نہ کرے تو ناخوش۔ کیا اللہ کی بندگی کے یہی معنی ہیں؟ اللہ کا بندہ تو وہ ہوتا ہے جو اس چیز سے خوش ہوتا ہے جس سے اللہ خوش ہو اور اس چیز سے بیزار ہوتا ہے جس سے اللہ بیزار ہو۔ اس شے کو پسند کرتا ہے جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ پسند کرتے ہوں اور اس شے سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ اور رسول نفرت کرتے ہوں۔ اللہ کے دوستوں کو دوست رکھتا ہے اور اس کے دشمنوں کو دشمن۔ ایسا ہی شخص ایمان کامل کی دولت سے بہرہ ور ہے، جیسا کہ ایمان کے معلم اور ہادی کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں پر اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔

"جس نے اللہ ہی کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اللہ ہی کے لیے خرچ کیا اور اللہ ہی کے لیے (خرچ کرنے) سے رک رہا اس نے ایمان کی پوری دولت حاصل کر لی۔"

"ایمان کا سب سے مضبوط وسیلہ حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔"

"تین چیزیں جس کے اندر ہوں گی وہی ایمان کی حلاوت اور لذت پائے گا (۱) اللہ اور اس کا رسول ساری کائنات سے زیادہ اس کو محبوب ہوں۔ (۲) جس سے بھی محبت رکھے صرف اللہ ہی کے لیے رکھے۔ (۳) کفر سے نکل آنے کے بعد اس کی طرف لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا آگ میں پڑنے کو ناپسند کرتا ہے۔"

جب کوئی شخص ایمان کی اس منزل پر پہنچ لے گا، تب ہی وہ اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدم رضا کے ماتحت کر سکے گا اور اسی وقت کون و مکان کی ہر شے سے بڑھکر اللہ اور رسول اس کی نگاہوں میں عزیز ہوں گے اور مخلوق کی محبت اگر وہ کرے گا تو محض خدا کے لیے نہ کہ کسی دوسری غرض سے۔ اس طرح اس کی یہ محبتِ خلق بھی محبتِ خداہی کا تقاضا بلکہ اس کا ایک تکمیلی پہلو ہوگی۔ کیونکہ عشق کا اصول ہی یہ ہے کہ "ندیم دوست" سے بھی "بوئے دوست" آتی ہے، اور محبوب کے محبوب کی محبت، کمالِ محبت کی نشانی ہے۔

حبِ رسول کی حقیقت یہیں سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اولیاء کی محبت کی حقیقت کا بھی سراغ مل جاتا ہے۔ ایک شخص جو ان برگزیدہ بندوں کی محبت اس لیے، اور محض اسی لیے کرتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے پسندیدہ طریقوں کے رہبر اور رہنما ہیں، تو گویا اس نے ان کی محبت خداہی کے لیے کی نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے۔ قرآن مجید کہتا ہے:-

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ - ۸)	تو عنقریب اللہ تعالیٰ کچھ دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اس کو محبت ہوگی اور جن کو اس سے محبت ہوگی۔ مومنوں کے لیے بالکل نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ مومنوں اور خدا پرستوں سے نرمی، اخوت اور محبت کے ساتھ پیش آنا محبتِ خداوندی ہی کا لازمہ اور اسی کا فطری اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران - ۴)	اے نبی لوگوں سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اور یہ اس لیے کہ نبی ان کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے، نیز خود انھیں کاموں کو کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور ان کاموں سے روکتا ہے اور خود بھی رکتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ایسی حقیقتوں کی خبر دیتا ہے جن سے بنی نوع انسان کا باخبر ہونا اور جن کو ماننا اللہ کو محبوب و مطلوب ہے۔ اس لیے جو محبِ خدا ہونے کا ادعا رکھتا ہو، اس کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ رسولِ خدا کا اتباع کرے۔ اس نے غیب و شہود کی جن حقیقتوں کی خبر دی ہو ان کی تصدیق کرے۔ اس کے ایک ایک حکم کے سامنے بخوشی سرِ تسلیم و طاعت خم کر دے اور میدانِ زندگی میں اپنا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے رسول کا نقشِ قدم دیکھ لے۔ جس نے ایسا کیا وہ محبتِ الٰہی کے دعویٰ میں سچا اور امتحان میں کامیاب رہا اور انجام کار خدا کی محبوبیت کے شرف سے سرفراز۔

محبتِ الٰہی کی دو علامتیں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو اپنی محبت کا نشان قرار دیا ہے، اتباعِ رسول اور جہاد فی سبیل اللہ —— جہاد فی سبیل اللہ یعنی خدا کی محبوب چیزوں —— ایمان اور عمل صالح —— کے حاصل کرنے میں، اور خدا کی ناپسندیدہ چیزوں —— یعنی کفر و فسق اور تمرد و عصیان —— کے مٹا ڈالنے میں اپنی ساری قوتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنا —— چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ - ۳)	اے نبی ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان، تمہارے وہ اموال جنھیں تم نے کما رکھا ہے تمہاری وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے کا تمھیں کھٹکا لگا رہتا ہے، اور تمہارے دل پسند مکانات تمہاری نگاہوں میں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب (اور قیمتی) ہیں تو پھر ٹھیرو کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کرے۔

غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کتنی ہیبتناک وعید سنائی ہے جو اللہ اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں اپنے اہل اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ احادیث میں تو بالکل کھلا ہوا مطالبہ موجود ہے کہ:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نظروں میں اس کے بیٹے اور اس کے باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے عرض کیا کہ:۔

"یا رسول اللہ! آپ، مجھے اپنی جان کے سوا باقی ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔"

ارشاد ہوا کہ:۔

"نہیں اے عمر! (ایمان کے حقیقی حامل تم نہیں ہو سکتے) تا وقتیکہ میں تمہیں، تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کی فضائے قلب میں ایک برقی انقلاب سا ہوا، پکار اٹھے "خدا گواہ ہے کہ آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔" فرمایا "ہاں! اب اے عمر!"

پس کمال محبت حاصل کرنے کے لیے محبوب سے کامل موالات کا جذبۂ صادق پیدا کرنا ضروری ہے۔ "کامل موالات" کا مطلب یا اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی پسند اور ناپسندیدگی اور اپنی محبت اور عداوت کو محبوب کی محبت و عداوت کے ماتحت کر دیا جائے۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ محبوب حقیقی ـــ اللہ تعالیٰ ـــ کی پسندیدہ چیزیں، ایمان اور تقویٰ ہیں اور ناپسندیدہ چیزیں فسق اور عصیان ـــ نیز یہ ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے کہ محبت قلب انسانی کا ایک زبردست محرک ہے۔ جب کبھی وہ انسان کے دل میں رسوخ حاصل کرتی ہے تو اس کو اپنی محبوب چیز وں کے حاصل کرنے پر ابھارتی رہتی ہے۔ اگر محبت، حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے تو محبوب کے حصول کا ارادہ بھی عزم اور حزم کی آخری بلندی پر ہوگا۔ اب اگر بندہ باعتبار اسباب و ذرائع اس پر قادر ہو سکتا ہے تو اس کو حاصل کیے بغیر دم نہ لے گا۔ اور اگر عجز و درماندگی اس کی راہ روک لیتی ہیں اور اپنی انتہائی کاوش کے باوجود اسے حاصل کرنے سے مجبور اور معذور ہو جاتا ہے تو بھی اس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا عملاً کامیاب ہو جانے والے اور اس کو کر گذرنے والے کے لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

"جس شخص نے ہدایت کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس ہدایت کے ماننے والوں کو ملے گا، اور یہ ان کے اجر میں بغیر کسی کمی کے ہوگا۔ اسی طرح جس نے لوگوں کو گمراہی کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی عذاب ہوگا جتنا اس کا اتباع کرنے والوں پر، اور ایسا ان پیروکاروں کے عذابوں میں بغیر کسی تخفیف کے ہوگا۔"

جہاد میں تمنائے شدید رکھنے کے باوجود جو لوگ حصہ لینے سے کسی نہ کسی بنا پر معذور رہتے۔ ان کے متعلق فرمایا:۔

"مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو ہر میدان اور ہر وادی میں، جس کو تم نے اپنی مجاہدانہ تگ و دو میں طے کیا، تمہارے ہمرکاب تھے۔"

صحابہ نے پوچھا "کیا مدینہ میں رہتے ہوئے بھی (وہ ہمارے ساتھ تھے)؟" جواب دیا "مدینہ میں رہتے ہوئے بھی، عذر نے انہیں روک رکھا تھا۔"

جہاد کی حقیقت جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ جہاد نام ہے حق تعالیٰ کی محبوب چیزوں کے حاصل اور برپا کرنے اور اس کی مبغوض و ناپسند چیزوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی تمام طاقتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنے کا۔

حُبِّ رسول اور محبت الٰہی کا معیار بس جہاد ہی دراصل وہ کسوٹی ہے جس پر ہر بندۂ الٰہی کا دعوائے حُبِّ الٰہی کس کر پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر بندہ طاقت اور قدرت رکھنے کے باوجود، اپنی طاقت کے مطابق، فریضۂ جہاد بجا نہیں لاتا، تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ اس کی محبت اپنے اندر کوئی مضبوط روح نہیں رکھتی۔ بندہ اس فرض کی ادائگی میں اپنی استطاعت کے لحاظ سے جتنی سستی اور بے توجہی دکھائے گا اتنا ہی اپنی محبت کے کھوکھلے پن کا زبان حال سے اقرار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فرض کی بجاآوری کا راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے، لیکن محبت کی اس سنت کو کون نہیں جانتا کہ محبوب تک رسائی اور باریابی عموماً خطرات اور مصائب اٹھانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ محبت صالحہ کی بھی یہی سنت ہے اور یہی محبت فاسدہ کی بھی۔ حکومت کا شیدائی تخت حکومت کو، دولت کا پرستار خزانۂ دولت کو، حسن صورت کا دیوانہ وصال محبوب کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک، اس عالم میں پیش آجانے والے عذاب شدید کے علاوہ، اس دنیا میں بھی ہولناک مصیبتوں سے دوچار نہ ہولے۔ اس لیے اگر اللہ اور رسول کا محب ان کی محبت کی راہ میں اتنی جانبازی بھی نہ دکھائے جو غیر اللہ سے محبت رکھنے والوں میں سے ایک صاحب عقل و عزیمت اپنے محبوب کی خاطر دکھاتا ہے، تو یقیناً وہ اپنی محبت کی کمزوری اور سطحیت کی ایک ناقابل تردید دلیل دیتا ہے، حالانکہ مومن کی نمایاں صفت یہ ہے کہ ساری کائنات سے زیادہ اس کو اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (بقرہ - ۲۰) اور جو اہل ایمان ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

ہاں! ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ محبت میں صرف جوش اور خلوص ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی ضمانت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ساتھ عقل اور ہوش کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ محب صادق، سچی محبت رکھنے کے باوجود، اپنی عقل کی کمی، نظر کی کوتاہی اور تصور کی ناراستی کے باعث ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچتا۔ اور ایسی راہ تو اس وقت بھی مذموم ہوتی ہے جب کہ محبت صالح ہو۔ اور اگر محبت فاسدہ میں کوئی اس طرح کی راہ اختیار کرے تو پھر اس کی محرومی کا کیا پوچھنا جیسا کہ حکومت، دولت اور صورت کے بعض اندھے دیوانے کیا کرتے ہیں۔ ایک تو ان کی محبت کا رخ ہی غلط ہوتا ہے، دوسرے اس کے حصول میں عقل و خرد کی تمام ہدایتوں سے آزاد ہو جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کچھ نہیں لگتا، البتہ طرح طرح کی مصیبتیں اور خواریاں انھیں اپنی آماجگاہ ضرور بنا لیتی ہیں۔ پس راہ محبت میں سررشتۂ عقل کا دامن ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، ورنہ کامیابی سراب ثابت ہوگی۔

(باقی)

حضرت یوسف علیہ السلام

اور

غیر اسلامی نظام حکومت کی رکنیت

(از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر یوپی سابق نائب دیوان ریاست دتیا)

ترجمان القرآن بابت مارچ و اپریل ۱۹۴۴ء میں "رسائل و مسائل" کے عنوان کے تحت کسی صاحب کا استفسار اور مولانا مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا ہے۔ ذیل کے سطور میں راقم الحروف کچھ مختصر تنقید مولانا مودودی صاحب کے جواب پر ہدیۂ ناظرین کرتا ہے۔

مستفسر صاحب کا استفسار یہ ہے:-

"قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرہ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ ایک رسول تھے اس لیے فریضۂ رسالت کی سرانجام دہی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربار فرعون کے مرد مومن نے اپنی تقریر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسف کی نبوت پر قوم فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا لیکن فرعون اور اس کی قوم اس پر ایمان نہیں لائی اس کے باوجود حضرت یوسف اُس کی حکومت میں شریک کار رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول غیر خدائی نظام حکومت کا شریک کار کس طرح رہا.........."

اوپر کے استفسار کے جواب میں مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں: "بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرا ہے قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے اس لیے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے، تاہم قرآن مجید نے اپنے مجمل اشارات سے اس امر میں شک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی بلکہ وہی مختار کل تھے اور انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کل اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوں، اس آیت کو بغور پڑھیے: قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منها حیث یشاء۔ خط کشیدہ فقرے صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات ہی۔ خزائن الارض کا لفظ دیکھ کر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ جگہ شاید خازن عمبریا ریونیو ممبر کی تھی حالانکہ دراصل اس سے مراد ملک کے جملہ وسائل (Resources) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دے دیے جائیں اور اس کے نتیجہ میں جو اختیارات انھیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی۔"

مستفسر نے جو بات دریافت کی تھی اور جو بات دراصل بحث طلب ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ آیا یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت

کے رکن اور شریک کار بنے یا نہیں۔ اور اگر بنے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایسا کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تھا یا نہیں۔ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی"۔ اور تعجب ہے کہ اپنی اس رائے کی تائید میں کلام پاک کی وہی آیت قال اجعلنی الی آخرہ پیش کرتے ہیں جو در اصل اس کے ضد کو ثابت کرتی ہے۔

آیت مذکور کا لفظی ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"یوسف نے کہا مجھکو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا۔ اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا"۔

اب دیکھیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون مصر سے خواہش کرتے ہیں کہ تو مجھکو اپنے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دے فرعون آپکا مطالبہ منظور کرتا ہے اور آپ فرعون کے محکمہ مال کے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آپ فرعون کے نظام حکومت کے ایک رکن یا شریک کار بن جاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب اس بدیہی نتیجہ سے بچنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ فرماتے ہیں کہ "مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات"..... اول تو کلی کا لفظ کلام پاک میں ہے ہی نہیں، یہ لفظ مولانا اپنی طرف سے کلام پاک کی عبارت پر بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ کلام پاک مولانا کے ذاتی نظریوں کا تابع ہو جاوے نہ یہ کہ مولانا اپنے ذاتی نظریوں کی اصلاح مفہوم قرآنی کے مطابق کر لیں۔ اسی جیسی ذہنیت کے متعلق غالباً اقبال مرحوم نے کہا تھا "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"۔ لیکن اس کلی کے لفظ کے ناجائز اضافے سے بھی مولانا کے اجتہاد یا نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کلی اختیارات مال کا مطالبہ کیا تھا اور کلی اختیارات ہی ملے تھے لیکن وہ اختیارات فرعون مصر ہی سے تو مانگے گئے تھے اور فرعون مصر ہی نے تو وہ اختیارات عطا کیے تھے اس لیے باوجود ان کلی مالی اختیارات کے حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت کے نظام حکومت میں ایک رکن یا ایک شریک کار سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح مولانا مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دیدیے جاویں اور اس کے نتیجہ میں جو اختیارات ان کو ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی"۔ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ مان بھی لیا جاوے کہ یوسف علیہ السلام نے مال کے جملہ اختیارات کا مطالبہ کیا تھا اور مال کے جملہ اختیارات آپ کو تفویض ہو گئے تھے تاہم سلطنت میں مال کے علاوہ بہت سے دیگر محکمے ہوتے ہیں مثلاً پولیس، فوج، عدالت۔ ان میں سے کسی کا مطالبہ یوسف علیہ السلام کی طرف سے کیا گیا نہ یہ محکمے آپ کے سپرد کیے گئے تو پھر مولانا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ "جو اختیارات انھیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی" بالکل بے بنیاد ہے۔

اس لیے یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر کے خزائن پر متصرف ہونے کے بعد بھی سلطنت کے ایک رکن یا شریک کار کی رہتی ہے جب تک کہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت نہ ہو کہ فرعون مصر اپنی سلطنت اور حکومت سے دست بردار ہو گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی جگہ مصر کے بادشاہ اور ملک بن گئے تھے سو یہ تاریخ سے ثابت ہے نہ کلام پاک سے بلکہ خود کلام پاک سے بصراحت اس کی تردید ہوتی ہے۔

آیت زیر بحث سے عین ماقبل یہ آیات ہیں

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي	انھیں میرے پاس لے آؤ کہ میں انھیں اپنے لیے چن لوں
فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ	پھر جب اس نے (یعنی یوسف علیہ السلام) بات کی کہا بیشک آج ہمارے یہاں معزز معتمد ہو۔

ان ہر دو آیات سے بالکل واضح ہے کہ فرعون مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنی سلطنت کا معزز اور معتمد رکن اور اپنا مشیر خاص بنایا۔ ان آیات میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں کہ فرعون مصر اپنی سلطنت یا اپنے اختیارات سے دست بردار ہو گیا۔ نیز ایک مابعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے عرصہ بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا کیونکہ جب برادران یوسف دوسری مرتبہ غلہ کی بھرتی کرنے آئے ہیں اور اپنے ساتھ حضرت یوسفؑ کی خواہش کے مطابق حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کو بھی لائے اور حضرت یوسف نے اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس رکھا اور بن یامین پر ظاہر بھی کر دیا کہ وہ ان کا حقیقی بھائی ہے مگر اپنے دوسرے بھائیوں پر اس امر کو ظاہر نہیں کیا اور چونکہ حضرت یوسف بن یامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لیے دوسرے بھائیوں پر اس امر کے ظاہر کیے بغیر کہ بن یامین ان کا بھائی ہے اس کی یہ تدبیر کی کہ جب برادران یوسف کے واسطے ان کا اسباب تیار کر دیا گیا تو بن یامین کے اسباب میں ایک پانی پینے کا پیالہ رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو موذن یا پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلہ والو تم البتہ چور ہو۔ برادران یوسف نے اس سے انکار کیا تو پکارنے والے نے کہا کہ کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ برادران یوسف نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔ اس کے بعد تلاشی لی گئی اور پیالہ بن یامین کے اسباب میں سے برآمد ہوا۔ چنانچہ بن یامین پیالے کے بدلے میں روک لیے گئے۔ اس موقع پر ارشاد خداوندی ہے "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ" جس کا لفظی ترجمہ ہے "وہ (یعنی یوسف) ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ۔"

خط کشیدہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا اور اس قانون کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یامین کو چوری کے الزام میں اپنے بھائیوں سے نہیں لے سکتے تھے مگر خداوند عالم نے خود ان کے بھائیوں کے منہ سے کہلوا دیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے چوری کا مال ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کی جو تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے کی ہے وہ یہ ہے کہ "یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس سے مال نکلے اس کو غلام بنا لو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ اپنے اقرار میں بندھ جاویں تو ملکی قانون کے مطابق کوئی صورت بن یامین کے روک لینے کی نہ تھی۔"

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ بر خلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جبکہ آپ ابھی جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے ساتھی قیدیوں سے فرماتے ہیں یٰصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار۔ ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم و اٰباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ۔ اسی طرح وزارت کے عہدہ پر متمکن ہونے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا تبلیغ کا کام ضرور جاری رکھا ہوگا۔ البتہ جو بات ان آیات سے بلاشک و شبہ کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا اور یوسف علیہ السلام کے اس عمل پر بجائے اس کے کہ خداوند عالم کی طرف سے کوئی سرزنش کی جاوے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کو ایک طرح سے سراہا جاتا ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کے اس تمکن فی الارض کو انعام خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "وکذٰلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منھا حیث یشاء"۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان

تو مسلمان ابنیا تک کے لیے غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا جائز ہے اور جائز ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں بطور فرض کفایہ کے واجب ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خود خواہش کر کے مصر کے خزائن پر متصرف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا کرنے کو یوسف علیہ السلام اپنے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر واجب خیال فرماتے تھے ورنہ وہ فرعون سے ایسی خواہش کبھی نہ فرماتے اور نہ ایسی خواہش کرتے وقت وہ اپنے حفیظ و علیم ہونے کا اظہار کرتے کیونکہ اگر آپ کے نزدیک ملک مصر کا وزیر بننا آپ پر لازم اور واجب نہیں تھا تو آپ کا اپنے آپ کو حفیظ اور علیم بتانا بجا مدح سرائی اور خودستائی میں داخل ہوتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ جو اس آیت پر مولانا نے لکھا ہے بڑی حد تک میرے خیال کی تائید کرتا ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:۔

"یعنی دولت کی حفاظت بھی پوری کروں گا اور اس کی آمد و خرچ کے ذرائع اور حساب و کتاب سے بھی خوب واقف ہوں۔ یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے ذمہ لیا تاکہ اس ذریعہ سے عامہ خلائق کو پورا نفع پہنچا سکیں خصوصاً آنے والے خوفناک قحط میں نہایت خوش انتظامی سے مخلوق کی خبرگیری اور حکومت کی مالی حالت کو مضبوط رکھ سکیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمدردی خلائق کے لیے الیات کے قصوں میں پڑنا شان نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ نیز اگر ایک آدمی نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح نہ بن پڑے گا تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے۔ اور اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصائل حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں ہے۔"

مولانا عثمانی صاحب کی اوپر کی تفسیر سے بھی ناظرین کرام پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حضرت یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے ذمہ لیا تھا وہ مختار کل یا خود مختار حاکم نہیں بن گئے تھے۔ عبدالغفار صاحب جند واڑی جن کا مراسلہ "مسلمان" لاہور مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۲ء شائع ہوا ہے اپنے مراسلہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک انگریزی عدالتی اور پولیس کی نوکری جائز ہے۔ نیز مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے بھی بشرط عدم ظلم و معصیت جائز لکھا ہے بلکہ ضرورتاً مقصد اسلامی قرار دیا ہے"۔

علماء متاخرین میں حکیم الامۃ مولانا مولوی اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مسلم طور پر اس پایہ کے فقیہ تھے کہ ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک بھی موجودہ نظام حکومت میں ملازمت کرنا ناجائز نہیں تھا کیونکہ ان کے بعض اہل خلیفہ سرکاری ملازم تھے جیسے مولانا خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری۔

جمعیۃ العلماء ہند جو ہندوستان کے مستند علماء کی سب سے بڑی جماعت ہے اس کے نزدیک بھی موجودہ نظام حکومت کا رکن بننا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ علماء کی اس محترم جماعت کے علم اور اجازت سے پچھلی کانگریسی حکومتوں کے دور میں بہت سے مسلمان کانگریسی حکومتوں کے ممبر بنے۔ اس لیے جمہور علماء کا مسلک یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کا رکن بننا اور اس حکومت کے نظام میں حصہ لینا ناجائز نہیں ہے۔ اس اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون کی حکومت کا رکن یا شریک کار بننا در انحالیکہ وہ حکومت اپنے کفر پر قائم تھی ہمارے لیے ایک سند کا کام دے سکتا ہے یا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور جمہور علماء ہند کا اس باب میں اجتہاد ہمارے لیے قابل اتباع ہے تو مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے وہ سب فتاوے جو مسلمانوں کو موجودہ نظام حکومت میں کسی حیثیت سے ملازمت کرنے سے روکتے ہیں اور ایسے مسلمانوں کی اس آمدنی کو جو ان ذرائع سے ہوئی ہو حرام بتاتے ہیں مثل حرف باطل کے مٹا دینے کے قابل ہیں۔ برخلاف اس کے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال اور عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے موجودہ نظام حکومت میں

شریک کار ہونا نہ صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ بطور فرض کفایہ کے واجب ہے جس کی تائید میں علاوہ اوپر کی نقلی دلائل کے کچھ عقلی دلائل بھی پیش کی جاتی ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) اگر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں مسلمانوں کو کچھ اختیارات حاصل ہیں یا مسلمانوں کو اتنی قدرت ہے کہ اس غیر مسلم حکومت میں وہ کچھ اختیارات حاصل کر سکیں تو ان اختیارات سے بالکل دست بردار ہو جانا یا باوجود قدرت کے اس غیر مسلم حکومت میں اختیارات حاصل نہ کرنا کس طرح خدمت دین یا اسلام ہو سکتا ہے۔ صحیح نقطۂ نظر تو غالباً اس امر کا متقاضی ہوگا کہ اگر مسلمان کفرستان میں یا کسی غیر مسلم حکومت کے تحت رہتے ہیں تو اس کفرستان یا غیر مسلم حکومت کے نظام میں جس قدر اختیارات حاصل کرنے پر بھی مسلمانوں کو قدرت ہو اس قدر اختیارات مسلمان ضرور حاصل کریں کیونکہ جس نسبت سے کسی کفرستان میں مسلمانوں کو اختیارات حاصل ہوں گے اسی نسبت سے کفر کا زور گھٹے گا (یہ میرے ایک مضمون "اسلامی جماعت" اور دیگر سیاسی جماعتوں کے پروگرام کا تقابل مطبوعہ منشور دہلی مورخہ ۲۴ و ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کا انتخاب ہے تفصیل کے لیے مضمون ملاحظہ ہو)

(۲) مسلمان اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں بطور محکوم کے رہتے ہیں اور اس نظام حکومت میں ان کا کوئی حصہ، ان کا کوئی دخل، ان کو کوئی اختیار نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان کی محکومیت اور غلامی درجۂ اتم کو پہنچ جاتی ہے جس نسبت سے مسلمانوں کو اس حکومت میں بذریعہ اس حکومت کی رکنیت کے بطور اس حکومت کے شریک کار ہونے کے اختیارات حاصل ہوتے جاویں گے اسی نسبت سے ان کی محکومیت اور ان کی غلامی میں کمی آتی جاوے گی۔

(۳) مسلمان ایک غیر مسلم نظام حکومت میں بطور محکوم کے رہتے ہیں اس حکومت کی مشینری میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اس حکومت کی مشینری کا کوئی کل پرزہ ان کے اختیارات اور قبضہ میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں ایک دوسری قوم بھی بطور محکوم کے رہتی ہے۔ مگر یہ دوسری قوم حکومت کی مشینری میں حصہ دار ہے اور برابر کوشش کرتی ہے کہ اس کا حصہ اور اختیار اس مشینری میں روز بروز بڑھتا جاوے اگر کسی وقت یہ نظام حکومت درہم برہم ہو جاوے تو بظاہر اسباب مسلمانوں کو جو اب تک اس حکومت کی مشینری سے بالکل باہر تھے اس حکومت کی مشینری پر قبضہ کرنے میں زیادہ سہولیت ہوگی یا اس دوسری قوم کو جو پہلے سے اس حکومت کی مشینری کے کل پرزوں سے واقف ہے اور ان میں سے بہت سوں پر پہلے سے قابض ہے۔

(۴) مسلمان مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی ہدایت کے مطابق فرض کیجیے کہ موجودہ نظام حکومت سے ہر قسم کا اشتراک عمل ترک کر دیتے ہیں۔ نہ اس کی ملازمت اختیار کرتے ہیں نہ اس کی کسی قسم کی رکنیت قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس عدم تعاون سے کوئی ذرہ بھر نقصان بھی اس نظام حکومت کو پہنچتا ہے یا حکومت کی مشینری کے چلنے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ رکاوٹ بھی پیدا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ نہیں (اگر کوئی صورت ہے کہ جس میں مسلمانوں پر کسی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرنا ضروری ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ایسے عدم تعاون سے اس حکومت کی گاڑی کا چلنا بالکل بند ہو جاوے یا اس کے چلنے میں معتد بہ رکاوٹ پیدا ہو جاوے) برخلاف اس کے مسلمان اس عدم تعاون کی وجہ سے بہت سے ضروری علوم و فنون اور معلومات سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں، مثلاً ریلوے، تار برقی، ریڈیو۔ یہ سب محکمات گورنمنٹ کے قبضہ میں ہیں۔ مسلمان ان محکموں میں ملازمت یا ان میں شریک کار ہونے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر مسلمان مثلاً ریلوے میں کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں تو مسلمان بحیثیت ایک قوم اصل ایک تحریک پیروں کے ریلوے کی عمل و تعامل [illegible] سے ناواقف و نابلد رہتے ہیں نہ ہم کو ریلوے لائن ڈالنا آوے گی، نہ ریلوے انجینئرنگ کا ہم سے واقفیت ہوگی، نہ لوکو موٹو! [illegible]

انجن بنانا آوے گا، نہ ریلوے کی سڑک اور پل تیار کرنا جانیں گے۔ اسی طرح تار برقی کا محکمہ حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس محکمے میں ملازمت کرنے یا اس کے رکن بننے سے احتراز کرنے کی صورت میں تار برقی کے کام سے بھی بالکل ناواقف رہیں گے۔ یہی حال ریڈیو وغیرہ کا ہے۔ یہی حال ہمارا دیگر محکمات کے متعلق ہوگا۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی دیگر اقوام اپنے تعاون کی وجہ سے نہ صرف ان محکمات کے عمل سے واقف ہوں گے بلکہ ان محکمات کے عمال کی حیثیت سے بڑی حد تک ان محکمات پر قابض ہوں گے۔ لہٰذا اگر موجودہ نظام حکومت کسی وقت اپنے مواعید کے مطابق حکومت سے دست کش ہو جاوے یا ہندوستان کی رائے عامہ موجودہ نظام حکومت کو حکومت سے دست بردار ہونے پر مجبور کردے تو کون اس کا زیادہ اہل ہوگا کہ ان محکمات ریلوے، تار، ریڈیو وغیرہ پر قبضہ کر سکے۔ مسلمان جو ان محکموں کے کام سے بالکل ناواقف ہیں یا دیگر اقوام جو یہی نہیں کہ ان محکموں کے کام (Working) سے واقف ہوں گے بلکہ ان محکموں پر اس وقت بڑی حد تک قبضہ بھی پہلے سے کیے ہوئے ہوں گے۔

اوپر کی تقریر سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا یا اس کے عدالت اور مال کے محکموں میں عہدے قبول کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بطور فرض کفایہ کے واجب ہے تو یہ آپ سے آپ طے ہوگیا کہ ایسی عدالتوں میں بطور مدعی یا مدعا علیہ کے جانا جائز ہے مگر مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کا بڑی سختی کے ساتھ اصرار ہے کہ ان عدالتوں میں بحیثیت مستغیث یا مدعی کے جانا حرام ہے۔ اس نظریے کی مکمل تردید میں اپنے مضمون اسلامی جماعت اور دیگر سیاسی جماعتوں کے پروگرام کا تقابل مطبوعہ منشور دہلی مورخہ ۲۸ و ۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء میں کر چکا ہوں اس وقت اس بحث کے متعلق صرف ایک دو موٹی موٹی باتیں ہدیہ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

اگر انگلستان، جرمنی یا امریکہ میں کچھ انگریز، جرمن یا امریکن (American) اسلام قبول کرلیں، جیسا کہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ان مسلمانوں میں سے کسی کا مکان یا زمین کوئی انھیں ملکوں کا غیر مسلم غصب کرلے یا اس مسلمان کی عورت کو کوئی غیر مسلم اغوا کرلے جائے یا ان مسلمانوں میں سے کسی مسلمان عورت کے ساتھ کوئی مسلمان یا غیر مسلم زنا بالجبر کرے یا ان میں سے کسی مسلمان کو کوئی غیر مسلم قتل کر دے یا اس قسم کے واقعات مسلمانوں کے ساتھ خود یہاں ہندوستان میں پیش آویں جیسا کہ آتے رہتے ہیں تو کیا مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے نزدیک ان مظالم کی بابت ملکی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا اور ان میں استغاثہ دائر کرنا ناجائز اور حرام ہے؟ اگر ہے تو کیا یہ نظریہ دین میں بجائے یسر پیدا کرنے کا مترادف نہیں ہے؟ اگرچہ اسلام دین میں یسر پیدا کرنا چاہتا ہے نہ کہ عسر۔ ان اللّٰہ یرید بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج-۱۱) کیا اسلام جیسا مذہب اپنے پیروؤں کو ایسی تکلیف مالا یطاق دے سکتا ہے؟ کیا انگلستان یا جرمنی کے مسلمانوں پر شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ لازم ہے کہ اگر ان ملکوں میں کوئی مسلمان یا غیر مسلم یا ہندوستان میں کوئی مسلمان یا غیر مسلم ان کے حقوق کو غصب کرلے تو وہ اس کی دادرسی کے لیے اس وقت تک کا انتظار کرے جب تک ان ممالک میں خالص اسلامی حکومت قائم نہ ہو جاوے؟ کیا محض اس بات کا علم ہی کہ مسلمان ان ملکوں میں اپنے حقوق کے اتلاف کی کوئی دادرسی ملکی عدالتوں میں نہیں کریں گے غیر مسلموں کو خاص طور پر اس پر دلیر نہیں کر دے گا کہ وہ بے دھڑک مسلمانوں کے حقوق کا اتلاف کریں؟ مودودی شریعت مسلمانوں کے لیے ایسی تنگی اور عسر پیدا کرنے کی روادار ہو تو ہو اسلامی شریعت ایسی تنگی پیدا کرنے کی روادار نہیں ہوسکتی۔ مسلمان خود حضورؐ کے زمانے میں ہجرت کرکے حبشہ گئے اور کئی سال تک حبشہ میں رہے کیا کوئی حدیث یا روایت ایسی ہے کہ جو یہ ثابت کرتی ہو کہ اس ہجرت کے زمانہ میں مسلمانوں کو ملکی عدالتوں میں استغاثہ کرنے سے روکا گیا تھا؟ مسلمان چین میں بطور فاتح کے کبھی نہیں گئے بلکہ بطور تجارت گئے اور ان کی بڑی بڑی آبادیاں چین میں قائم ہوگئیں اور اب تک ہیں۔ مسلمان اور غیر مسلموں

کے درمیان کچھ نہ کچھ مناقشات ان مقدموں میں ضرور ہوئے ہوں گے۔ کیا مسلمان ان سب گزشتہ صدیوں میں ملکی عدالتوں میں استغاثہ دائر کرنے سے پرہیز کرتے رہے؟ اگر نہیں پرہیز کیا اور ملکی عدالتوں میں استغاثے دائر کرتے رہے تو کیا ان کا یہ سب عمل ناجائز اور حرام تھا؟ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے کہا جاوے گا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان خود اپنی حکومت بنا دیں، یا ان ممالک سے ہجرت کر جاویں۔ تو حکومت کا بنانا اس مظلوم کے اختیار میں تو نہیں ہے جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا جس کی زمین یا مکان غصب کیا گیا ہے یا جس کی عورت کی بے حرمتی کی گئی ہے، یا جس کے بیٹے یا بھائی کو قتل کیا گیا ہے۔ رہی ہجرت تو ہندوستان کے ۹ یا ۱۰ کروڑ مسلمان یا چین کے دو چار کروڑ مسلمان ہجرت کر کے کہاں جا سکتے ہیں اور کون ایسا ملک خالی پڑا ہے کہ جس میں وہ سما سکیں؟ علاوہ بریں مولانا مودودی صاحب اور "اسلامی جماعت" کے کہنے کے مطابق تو اسلامی ممالک مثل افغانستان، ترکی، مصر وغیرہ میں سے بھی کوئی ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان ہجرت کر کے جا سکتا ہے کیونکہ مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق ان سب میں بھی جو حکومتیں قائم ہیں وہ سب طاغوت کی حکومتیں ہیں اس لیے بیچارے مسلمانوں کے لیے "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن" کا مضمون ہے۔ کیا دین اسلام ایسے ناقابل العمل نظریوں کا حامل ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو مسئلہ زیر بحث تھا اس کے متعلق مجھکو جو کچھ عرض کرنا تھا وہ تو میں عرض کر چکا۔ اب مجھکو چند الفاظ مولانا مودودی صاحب کے اس ادعا کی بابت عرض کرنا ہیں کہ "اسلامی جماعت" ہی صرف وہ جماعت ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہنمائی کر رہی ہے، باقی جتنی دیگر سیاسی جماعتیں ہیں خواہ وہ مسلم لیگ ہو، احرار ہوں، خاکسار ہوں، یا آزادی پسند علماء ہوں (جن میں غالباً جمعیۃ العلماء بھی شامل ہے) ان سب جماعتوں کی اس باب میں اس وقت تک کی کل کارروائی مثل حرف باطل کے مٹا دینے کے قابل ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور "جماعت اسلامی" کے دستور، پروگرام یا لائحہ عمل میں اس وقت تک کوئی ایسی بات ہے جو اسلامی جماعت کو اس فخر و مباہات کا حق دیتی ہو؟ مولانا مودودی صاحب کی تقریر و تحریر اور جماعت اسلامی کے دستور اور جماعت اسلامی کے اجتماعات کی روداد کو آپ پڑھ جائیے، جو بات آپ کی توجہ خاص طور پر اپنی طرف کھینچے گی وہ نواہی کی کثرت اور اوامر اور عمل کی کمی یا فقدان ہوگا۔ مثلاً نے منہیات شرعیہ کی جو فہرست مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی طرف سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تیار کی گئی ہے اس میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) ملک میں جو نظام حکومت قائم ہے یا آئندہ قائم ہو اس کا رکن بننا ممنوع ہے۔

(۲) کسی میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بننا ممنوع ہے۔

(۳) ملکی عدالتوں میں مستغیث یا مدعی بن کر جانا ناجائز ہے۔

(۴) ملکی عدالتوں میں بطور وکیل کے پیروی کرنا ناجائز ہے۔

(۵) موجودہ نظام حکومت کی کسی قسم کی ملازمت اختیار کرنا ممنوع ہے

نمبر ۱، ۴ اور ۵ کے ذریعہ سے اگر مسلمانوں کو آمدنی ہو تو اس کا کھانا ناجائز اور حرام ہے۔ اسی کے ساتھ اگر پوچھا جاوے کہ کوئی اوامر بھی مولانا مودودی صاحب یا "اسلامی جماعت" کی طرف سے جاری ہوئے یا نئے اعمال (جو مسلمانوں کو کرنا چاہئیں) ان کی کوئی فہرست مولانا مودودی صاحب یا "اسلامی جماعت" کی طرف سے شائع ہوئی تو جواب آپ کو نفی میں ملے گا۔ خود افراد جماعت اسلامی کو اس کا احساس ہے اور وہ امیر جماعت سے دریافت کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ کام کرنے کو بتایا جاوے تو محض لفاظی کے ذریعہ سے ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اجتماع دربھنگہ کی روداد میں (دیکھو ترجمان القرآن بابت نومبر و دسمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۰

مولانا مودودی صاحب خود فرماتے ہیں "بہت سے ارکان جماعت ایسے ہیں جنھوں نے مجھ سے بالمشافہ اور بالمراسلہ یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے لیے پروگرام کیا ہے اور ہم کیا کریں۔ یہ پروگرام کا مطالبہ اور یہ تصور کہ ان لوگوں کے کرنے کے لیے کوئی کام بتایا نہیں گیا اس کی بنا یہی ہے کہ ہمارے رفقا ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھے ہیں کہ جس تحریک کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔" اس اوپر کے اقتباس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ جماعت اسلامی کا سیاسیات میں یا کسی دوسرے میدان عمل میں کوئی پروگرام نہیں ہے نہ افراد جماعت کو ابھی تک یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کریں۔ مزید برآں اسی دربھنگہ کے اجتماع کے موقع پر رفقا میں سے ایک صاحب نے ایک اسکیم پیش کی کہ "ارکان جماعت کو مال حرام سے اجتناب کی وجہ سے جو مالی مشکلات پیش آتی ہیں انھیں دور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اس طرز کی کاروباری اسکیمیں عمل میں لائی جاویں کہ کچھ مال دار اور کچھ کارندے مل کر دولت فراہم کریں اور یہ دولت ایک مقررہ تناسب سے سرمایہ لگانے والوں، محنت کرنے والوں اور جماعت کے بیت المال پر تقسیم ہوتی رہے......" (دیکھو صفحہ ۵۰۹ ترجمان القرآن بابتہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۳ء)

اس تجویز کی مولانا امین احسن صاحب نے مخالفت کی اور فرمایا کہ جماعت کو اپنی جماعتی حیثیت میں اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت اور جد و جہد کے سوا کوئی کاروباری حرکت نہیں کرنا چاہیے۔ امیر جماعت نے مولانا امین احسن کی اس رائے کی تائید فرمائی اس لیے محرک کو اپنی تجویز واپس لینا پڑی۔ اگرچہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ کسی جماعت کا مسلمانوں کی معاشی حالت کی درستی کی کوشش کرنا اس جماعت کی اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت میں حارج بن سکتا ہے تاہم اس تحریک پر بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ اسلامی جماعت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی نہ کوئی ایسا کام اس کے پروگرام میں ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کا بھی کوئی عملی پروگرام نہ مولانا مودودی صاحب کی کسی تقریر یا تحریر میں ہے نہ اسلامی جماعت کے دستور میں اس کی بابت کوئی دفعہ درج ہے نہ پبلک کے علم میں آیا کہ مولانا مودودی صاحب یا اسلامی جماعت نے اس وقت تک کوئی عملی اقدام اعلائے کلمۃ اللہ کی بابت کیا۔ نومبر ۱۹۴۳ء سے اس وقت تک جماعت اسلامی کے رفقا کے متعدد اجتماع دربھنگہ، دہلی اور حیدر آباد دکن میں ہو چکے ہیں ان اجتماعوں کی روئدادوں کو ملاحظہ کیجیے ان سے بالکل ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جماعت نے کوئی نیا قدم، نیا عمل، نئی کاروائی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کی ہو یا کوئی عملی کارروائی ایسی کی ہو یا کوئی عملی کارروائی اس کے پروگرام میں ایسی ہو جو موجودہ نظام حکومت کی قوت یا اثر کو کم کرنے یا مسلمانوں کے اثر یا قوت کو بڑھانے کا موجب ہو سکتی ہو۔ اگر کی ہے تو مولانا مودودی صاحب اور دیگر ارکان جماعت اس کو ظاہر فرماویں۔ یہی نہیں کہ جماعت اسلامی کی طرف سے اعلائے کلمۃ اللہ کے متعلق ابھی تک کوئی عملی کارروائی نہیں کی گئی بلکہ اگر کوئی دوسری جماعت اس باب میں کوئی عملی اقدام کرتی ہے تو مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے اس کی ہر طرح تنقیص کی جاتی ہے اور مسلمان عوام کی نگاہ میں اس کو مردود و مبغوض بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے دیگر ذرائع میں سے ایک ذریعہ یقینی طور پر یہ بھی ہے کہ جملہ کلمہ گو مسلمانوں کی تنظیم کی جاوے اور ان کو ایک سلسلہ میں منسلک کر کے ان کی اجتماعی قوت کو بڑھایا جاوے۔ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ مسلمانوں کی تنظیم کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کرتی ہے مگر مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے مسلم لیگ کی اس کی اس تنظیم کی بابت کیا کچھ تنقیص و تحقیق نہیں کی جاتی۔ اس لیے جماعت اسلامی کی طرف سے مناہی کی فہرست میں اس قدر اضافہ اور عمل کا یہ فقدان ہرگز اعلائے کلمۃ اللہ کا موجب نہیں ہو سکتا کیونکہ شارع اسلام کے یہاں امر کو نہی پر ہمیشہ مقدم کیا گیا ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی۔ اور ایمان کے ساتھ عمل نیک کی کلام پاک میں بار بار تاکید آئی ہے اور عمل کا ہی مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے یہاں فقدان ہے۔ کم از کم جماعت اسلامی کے دستور اور جماعت اسلامی کے اجتماعوں کی رودادوں سے

پتہ نہیں چلتا کہ جماعت اسلامی نے اپنے افراد کے لیے کوئی نئے اوامر جاری کیے ہیں یا جماعت اسلامی کے افراد نے کہیں ایسے نئے اعمال یا افعال کا کرنا اختیار کیا ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن سکیں یا جو مسلمانوں کی دینی یا دنیاوی فلاح و بہبود کا موجب بن سکیں اور جو افعال و اعمال عام مسلمان نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا جہاں تک عمل اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف عملی اقدام کا تعلق ہے، افراد جماعت اسلامی اور عام مسلمانوں کی حالت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اگرچہ منہیات سے بچنا افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے نہایت ضروری ہے تاہم کوئی قوم یا کوئی جماعت سلبی صفات کی بنا پر ترقی نہیں کر سکتی بلکہ ایجابی قوتوں کے زور پر ترقی کرتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت نے جو نئے نواہی کا اضافہ شرع اسلام میں کیا ہے ان کی بابت میں ثابت کر چکا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی شرع سے ثابت نہیں ہے لیکن بالفرض اس کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جاوے اور ان پر مسلمان عامل بھی ہو جاویں تو بھی ایسا عمل مسلمانوں کو حقیقی ترقی کی طرف نہیں لیجا سکتا۔ جو چیز مسلمانوں کو حقیقی ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے اور درحقیقت اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن سکتی ہے وہ عمل، ٹھوس عمل، سراسر عمل، پیہم عمل ہے اور اسی چیز کا مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے یہاں فقدان ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی منصف مزاج شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک اخلاقی اور شرعی مناہی سے بچنے کا تعلق ہے ہم مسلمان مغربی اقوام میں سے کسی سے بدتر حالت میں نہیں ہیں بلکہ مغربی اقوام میں اکثر و بیشتر اس بات میں ہم سے بدتر ہیں۔ اگرچہ ہماری اخلاقی حالت بھی کچھ بگڑ گئی ہے تاہم شراب خوری، قمار بازی، زناکاری اور دیگر بےحیائی اور فحش کی باتوں میں اکثر مغربی اقوام ہم سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ باوجود ان معائب کے مغربی اقوام ہم پر ہر پہلو سے غالب اور مستولی ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ محض اس وجہ سے کہ مغربی اقوام کے مقابلہ میں ہمارے یہاں فقدان عمل ہے۔ نہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں سے اس قدر کام لیتے ہیں نہ دماغ سے جس قدر کہ مغربی اقوام۔ نہ ہم فطرتی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں نہ اجتماعی فائدہ کے لیے ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں میں بدقسمتی سے پہلے ہی سے بہت کچھ جمود و تعطل موجود ہے۔ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت نواہی شرعیہ کی فہرست میں معتدبہ اضافہ کر کے اور ہمارے عمل کو جہاں تھا وہیں چھوڑ کر ہماری ترقی کو معکوس کرانا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی نظر میں اگر کوئی مسلمان موجودہ کونسلوں کی ممبری سے استعفا دیدے، میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری چھوڑ دے، ملکی عدالتوں میں وکالت کرنے سے اجتناب کرے، ملکی عدالتوں میں باوجود مظلوم ہونے کے استغاثہ دائر کرنے سے پرہیز کرے تو گویا اس نے بڑی خدمت دین کی اور اس کی یہ سلبی کارروائیاں بہت کچھ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن گئیں اور گو یہ کارروائیاں کرنے سے اس سادہ لوح مسلمان کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو کچھ دین کی خدمت اس پر واجب تھی اس کو اس نے باحسن الوجوہ انجام دیدیا اور اس کے بعد اس کو اور کچھ کرنا نہیں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس جیسی سلبی کارروائی کوئی اصلی خدمت دین نہیں ہے۔ اصلی خدمت دین یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسری اقوام سے اگر بہتر نہیں تو ان کی برابر تو ضرور اچھا اور کامیاب کاشتکار، اچھا اور کامیاب تاجر، اچھا اور کامیاب سائنسدان، اچھا اور کامیاب مجاہد فی سبیل اللہ بنے۔ اس اور صرف اسی طریقہ سے ایک مسلمان اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خدمت کے ساتھ سچی خدمت دین کر سکتا ہے۔ چونکہ مولانا مودودی صاحب اور ان کی اسلامی جماعت نے مسلمانوں کے مرض کی جو تشخیص کی ہے وہی غلط ہے اس لیے ان سے اس کے صحیح مداوے کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ رہا مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہنمائی کا بلند بانگ دعویٰ تو اس کے متعلق صرف اس قدر عرض ہے کہ اسلامی جماعت کے موجودہ پروگرام اور لائحہ عمل کے مطابق مسلمانوں کے لیے موجودہ نظام حکومت یا کسی آئندہ قائم ہونے والے نظام حکومت میں اس حکومت کا محکوم ہو کر رہنا تو جائز ہے مگر اس نظام حکومت کا باوجود قدرت کے حصہ دار اور شریک کار بنکر رہنا ناجائز اور حرام ہے۔ برخلاف اس کے کانگریس اور اس کے

ہم خیال علماء (آزادی پسند علماء) کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو غیر مسلم نظامِ حکومت میں اقلیت کی حیثیت سے حصہ دار بن کر رہنا چاہیے اور مسلم لیگ کا نصب العین یہ ہے کہ کم از کم ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مسلمان اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اب یہ ناظرین کا کام ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ ان تینوں جماعتوں میں سے کونسی جماعت مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہی ہے۔ فقط بس۔

ترجمان القرآن ۔ ہم جناب خان بہادر صاحب کے بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑ کر ہمیں پھر ایک مرتبہ اپنا نقطۂ نظر صاف صاف پیش کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ اگرچہ پچھلے تجربات کی بنا پر خود صاحب موصوف سے تو یہ امید نہیں ہے کہ وہ ہمارے دلائل ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی ترمیم کرنے پر راضی ہوں گے، لیکن ہم اس بحث میں اپنا وقت صرف اس امید پر صرف کر رہے ہیں کہ دوسرے بہت سے طالبینِ حق کو اس سلسلے میں اکثر ان گمراہ کن دلائل کا جواب مل جائے گا جو اطاعتِ غیر اللہ یا بالفاظِ دیگر اسلام بغیر اللہ کو جائز قرار دینے اور نظامِ کفر کی بندگی کو مباح بلکہ فرضِ کفایہ ٹھیرانے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں۔

قصۂ یوسف علیہ السلام کے زیرِ نظر پہلو پر ہم اس سے پہلے دو مرتبہ بحث کر چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ رمضان و شوال ۱۳۵۷ھ کے "اشارات" میں۔ دوسری مرتبہ ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ کے "رسائل و مسائل" میں۔ پہلی بحث زیادہ مفصل و مدلل تھی اور دوسری مجمل و مختصر۔ لیکن جناب خان بہادر صاحب نے نہ معلوم کیوں پہلی کو چھوڑ کر دوسری کو مدارِ گفتگو بنایا، حالانکہ جو اعتراضات انھوں نے اپنے مضمون میں درج فرمائے ہیں ان میں سے اکثر کا، بلکہ شاید سب ہی کا جواب ہماری پہلی بحث میں انھیں مل جاتا۔ بہرحال یہ عدمِ التفات خواہ کسی وجہ سے ہو، ہمارے لیے اس میں خیر ہی کا پہلو نکل آیا کہ جن باتوں کو خود بار بار چھیڑ کر واضح کرنا ہمارے لیے مشکل تھا انھیں دوسروں کے چھیڑنے پر بیان کرنے کا ہمیں موقع مل گیا۔

دنیا میں ایک معقول آدمی سے جن چیزوں کی توقع کی جاتی ہے غالباً ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں تناقض نہ ہو۔ ایک معمولی عقل کا گنوار آدمی بھی جب کسی شخص کو ایسی باتیں کرتے دیکھتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہوں تو فوراً ٹوک دیتا ہے، کیونکہ اس کی نہایت موٹی عقل بھی متناقض باتوں کی غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جن باتوں کی توقع کسی گھٹیا سے گھٹیا مگر ذی عقل انسان سے نہیں کی جا سکتی ان کی توقع اس خدا سے کی جاتی ہے جو خود عقل کا خالق اور تمام حکمت کا مالک ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ خدا سے اس انتہائی نامعقولیت کی توقع رکھنے والے، بلکہ اس کا مطالبہ کرنے والے کوئی جاہل، کودن لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ علماء ہیں جو دنیا بھر کو علم و عقل کے درس دیتے ہیں اور وہ فضلاء ہیں جن کی عقلیں اپنی دنیا کے معاملات چلانے میں خوب لڑتی ہیں۔ یہ ہوش مند حضرات اپنے خدا سے چاہتے ہیں اور یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ اس کی باتوں میں تناقض ہو، یعنی وہ یہ بھی کہے کہ میں بادشاہ زمین و آسمان ہوں اور پھر اپنی زمین کے کسی گوشے پر کسی اور کی بادشاہی تسلیم بھی کرے۔ وہ یہ بھی کہے کہ لوگو تم سب میرے احکام کی اطاعت کرو اور لوگوں کو یہ اجازت بھی دے بلکہ اس کو فرض تک قرار دیدے کہ ان حاکموں کی اطاعت بجا لائیں جو اس کے حکم کی سند کے بغیر اور اکثر حالات میں اس کے حکم کے خلاف احکام دیتے ہوں۔ وہ انسانوں کے لیے خود ایک قانون بھی بنائے اور یہ اعلان بھی کرے کہ میرا ہی قانون حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے اور پھر دوسرے قوانین کے نفاذ کو جائز بھی رکھے اور انہی انسانوں کو جن کے لیے اس نے قانون بنایا ہے یہ "حق" بھی دے کہ چاہیں خود اپنے لیے قانون بنا لیں اور چاہیں تو دوسروں کے قوانین کی پیروی کرتے رہیں۔ وہ اپنے پیغمبروں کو خاص اسی غرض کے لیے مبعوث بھی کرے کہ زمین کے باشندوں کو اس کا دین قبول کرنے کی دعوت دیں اور پھر انہی پیغمبروں کو یا ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت بھی دے

دلکہ خان بہادر صاحب کے بقول اس خدمت پر سراہے بھی) کہ ایک سوکھی او دین کے نظام میں کارکن و خدمت گزار بن جائیں اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں اپنی قابلیتیں صرف کر دیں۔ وہ ساری دنیا کے باشندوں میں سے چھانٹ کر ایک امت خاص اس مقصد کے لیے بنائے بھی کہ اُس معروف کا حکم دے جسے اس نے معروف قرار دیا ہے اور اس منکر کو مٹائے جسے اس نے منکر ٹھیرایا ہے، اور پھر اسی امت کے لیے اس بات کو حلال بلکہ اس کے بعض "برگزیدہ" افراد کے لیے فرض کفایہ بھی ٹھیرا دے کہ اُن منکرات کو قائم کرنے اور رواج دینے میں حصہ لیں جنھیں اس کے باغی معروف ٹھیرا چکے ہیں اور ان معروفات کو دبانے اور مٹانے میں آلۂ کار بنیں جو اس کے نافرمانوں کی نگاہ میں منکر قرار پا چکے ہیں۔ یہ ایسی صریح متناقض باتیں ہیں جن کے تناقض کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جو لوگ تفسیریں لکھنے اور فقہ و معقولات کے درس دینے کی قابلیت رکھتے ہیں اور جو اتنی عقل رکھتے ہیں کہ کلکٹری اور دیوانی جیسے بڑے بڑے مناصب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں انھیں با توان باتوں میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا یا پھر خداوند عالم کے متعلق ان کی رائے اتنی بری ہے کہ وہ اس سے ان بے عقلیوں اور نادانیوں کی توقع رکھتے ہیں جنھیں ایک جاہل گنوار بھی اپنی چوپال کے کسی رفیق میں پا کر صبر نہیں کر سکتا۔

خان بہادر صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک بعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے خزانن مصر پر متصرف ہونے کے بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا...... ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ (ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ) یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا۔"

ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت صاحب موصوف جس بات کے ثابت کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے اس نے شاید انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کچھ دیر ٹھیر کر اس صریح تناقض پر غور کر لیتے جو ان کی مزعومہ تفسیر کے لحاظ سے یہاں قرآن کے بیان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اب وہ ہمارے ہی توجہ دلانے سے غور فرمائیں۔ یہاں خود ان کے اعتراف کے مطابق مصر کے ملکی قانون کو، جو فرعون مصر کی حاکمیت کی بنا پر بنا تھا، "دین الملک" (بادشاہ کا دین) قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر دین صرف اس پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے جو مندروں اور معبدوں میں کی جاتی ہے بلکہ اس قانون کا نام بھی ہے جس کے مطابق پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے، جس کے تحت عدالت معاملات دیوانی و فوجداری کا فیصلہ کرتی ہے، جس کی پیروی میں ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے اور جس پر تمدن کا سارا انتظام قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے یہ سارے شعبے بحیثیت مجموعی جس طریقے پر چلتے ہیں اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "دین" ہے۔ اور چونکہ ملک مصر میں وہ طریقہ فرعون کی مشیت سے ماخوذ اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی تھا اس لیے قرآن اس کو "دین الملک" کہہ رہا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ "دین اللہ" بھی صرف اس چیز کا نام نہیں ہے جو سجدوں اور نماز روزے تک محدود ہو بلکہ اس سے مراد بھی اس پوری شریعت کی پابندی ہے جو اللہ کی رضا سے ماخوذ اور اس کی حاکمیت پر مبنی ہو اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لیے؟ یا "دین الملک" کو فروغ دینے کے لیے؟ اگر خان بہادر صاحب کی تاویل اور ان حضرات کی تفسیر، جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، مان لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی مخلوق کو اور خصوصاً اس مخلوق کو جو مصر میں رہتی تھی "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے، اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں "دین الملک" کے قیام و استحکام کی خدمت انجام دینے لگا اور لطف یہ ہے کہ اللہ میاں اس صریح تناقض

طرزِ عمل کا تناقض محسوس تو کیا فرماتے الٹا اس نبی کے اس فعل کو، خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگے اور نظامِ کفر میں اپنے نبی کے عہدۂ وزارت فائز ہو جانے کو "انعامِ خداوندی" سے تعبیر فرمانے لگے، گویا کہ اللہ میاں کا حال بھی معاذ اللہ ہمارے موجودہ زمانے کے ان دین دار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گٹا لیے ہوئے مصلّے پر سبحہ گردانی فرما رہے ہوتے ہیں مگر صاحبزادے جب ایم اے پاس کر کے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انسپکٹری پر فائز ہو جاتے ہیں تو وہی دینِ مجسم بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا۔

آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملکِ مصر کی وزارت پر متمکن ہو جانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغِ حق کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جبکہ آپ جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ .... البتہ جو بات ان آیات سے بلا شک و شبہ کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظامِ حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا۔"

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحب موصوف نے اپنے مدعا کی دُھن میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوجا جو معبدوں میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعتِ قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے ایک ہی خدا کے لیے ہو، یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہو جائے، تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسفؑ نے خود اپنی اس تبلیغِ حق کے خلاف عمل کیا۔ اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبدوں میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلتا رہے تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دو عملی کی تبلیغ تھی۔ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انھوں نے فرعون سمیت تمام لوگوں سے یہ کہا تھا کہ میں بادشاہِ زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، جیسا کہ تمام انبیاء کہتے رہے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ، تو اس اعلان کے ساتھ ان کا فرعون کی بادشاہی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی نظام کے بجائے غیر اسلامی نظام کی خدمت انجام دینا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اور اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لوگو! میں ہوں تو بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ مگر میرا مسلک یہ ہے کہ فرعونِ مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی یہی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو، تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک صریح متناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال سنجیدگی کے بجائے قہقہے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوانِ وزارت کے بجائے پاگل خانے میں جگہ ملنی چاہیے تھی، بلکہ آج بھی ایسی کتاب ہرگز ایمان لائے جانے کے قابل نہیں رہتی جو ایک طرف تو خود ہی یہ قاعدہ کلیہ بیان کرتی ہے کہ "خدا نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے" (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور دوسری طرف وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیر اللہ کا مطیع بن کر رہا اور دیگر بندگانِ خدا کو بھی اذنِ خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی غیر خدا کا مطیع بناتا رہا۔ قرآن اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا ہے کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، یعنی اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف بیان پاتے۔ لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرزِ خیال کے لوگوں کی تاویلات تسلیم کر لیں تو قرآن کے بیانات میں یہاں ایسے کھلے ہوئے تناقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن آپ اپنے ہی

پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کا کلام قرار پائے گا، بلکہ وہ "اُوڑ بڑ" جس کی تصنیف اسے سمجھائے گا بہرحال کوئی صحیح الدماغ انسان تو نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان بہادر صاحب جس طرزِ خیال کی نمائندگی فرما رہے ہیں وہ اپنے پیچھے اخلاقی انحطاط کی ایک طویل اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔ مسلمان جب اپنے اصل مقصدِ زندگی کو بھول گئے اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے اور دین داری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے خواہ مقاصدِ زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظامِ اجتماعی کی زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کی تابع فرمان ہوتی چلی گئیں۔ لیکن انھوں نے اور ان کے علما نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظامِ کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے بسر کی جائے۔ چنانچہ "اضطرار" کے بہانے سے اُس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر بسر کی جا سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ انھیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پلٹتے ہیں یا اپنی ضلالت میں بعید سے بعید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار جسے ابتداءً صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سنت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائمی، روز افزوں اور غیر متناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی، اور ہر نئے اضطرار نے مطالبہ کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لیے تجویز کیے ہیں انھیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ۔ مگر یہ جتنے عذاب خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انھوں نے یہ قاعدہ طے کر لیا کہ واقعی ہر اضطرار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تسلطِ کفر کی حدوں کو پھیلنے دیں۔ پھر اس "اضطرار" کے تصور نے بھی انھیں ستانا شروع کیا کیونکہ اضطرار کے نیچے حرمت کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ کون صاحبِ عقل اس صریح بات کو محسوس نہ کرے گا کہ جب آپ محض مضطر ہونے کی وجہ سے سور کا گوشت کھائیں گے تو بہرحال سور آپ کی نگاہ میں حرام تو ضرور ہی رہے گا۔ اور جب اسے آپ فی الاصل حرام سمجھتے ہوئے مجبوراً کھائیں گے تو ناممکن ہے کہ آپ کے دل میں اس سے نفرت و کراہیت نہ ہو، ناممکن ہے کہ آپ اس سے لذت لیں، شوق سے کھائیں، زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کریں اور اس کے کباب اور قورمہ اور پلاؤ پکوانے کی فکر کریں۔ ایسا ہی تنفر اور اجتناب ان تمام معاملات میں بھی ناگزیر طور پر پیدا ہوتا ہے جنھیں آپ حقیقت کے اعتبار سے حرام سمجھتے ہوں اور صرف اضطرار کی وجہ سے اپنے لیے عارضی طور پر جائز کر لیں۔ مگر ایک پوری قوم کا اپنی زندگی کے سارے تمدنی، معاشی، سیاسی معاملات میں دائماً اس طرح رہنا کہ اس پر اضطرار کی شرعی و نفسیاتی کیفیت طاری رہے اور وہ حاضر الوقت نظامِ زندگی سے نفرت و کراہیت کے ساتھ ہمہ گیر اجتناب کرتی رہے اور صرف اُس حد تک اس سے تعلق رکھے جس حد تک ایسا تعلق رکھنے کے لیے ناگزیر ہو، عملاً محال ہے۔ ایسی حالت کو ایک قلیل مدت سے زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بہت جلدی طبائع اس سے تھک جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تھکاوٹ بھی مسلمانوں میں ٹھیک اپنے وقت پر پیدا ہوئی۔ لیکن پہلے سے دینی انحطاط جس تسلسل کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا اس نے ان تھکنے والوں کے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ اپنے اس غلط نظریہ پر نظرِ ثانی کرتے جو "نظامِ کفر میں اسلامی زندگی" کے امکان کے متعلق انھوں نے ابتداءً قائم کیا تھا اور اس حالتِ اضطرار کو ختم کرنے کی تدبیر سوچتے جس کی وجہ سے وہ ہر طرف ہر شعبۂ زندگی میں حرمتوں سے محصور اور خبائث میں مبتلا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس دینی انحطاط کی سابق رفتار انھیں جس رخ پر بڑھا لے گئی وہ یہ تھا کہ سرے سے "اضطرار" کے بہانے ہی کو ختم کر دیں تاکہ جو حرمتیں نظامِ کفر میں ترقیات اور آسائشوں کے دروازے ان پر بند کیے ہوئے ہیں وہ ٹوٹ جائیں اور اباحت و حلت میں تبدیل ہو کر رہیں۔ اس غرض کے لیے دین کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا کہ اس کا تعلق صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی امور مثلاً نکاح و طلاق

سے ہے۔ اگر ان معاملات میں کوئی نظامِ حکومت مسلمانوں کو امن دینے کا ذمہ لے لے تو اسلامی زندگی کا اصل مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دارالکفر دارالامن ہے، اس کی وفاداری و اطاعت لازم ہے، اس کے تحت سارے تمدنی معاملات (جو اس نئے نظریہ کے مطابق دنیا بمقابلۂ دین کے زیرِ عنوان آجاتے ہیں)، انہی قوانین کے مطابق چلنے چاہییں جو کافرانہ اصولوں پر بنائے گئے ہوں، اور اس کی قانونی و انتظامی مشین کو چلانے میں بلکہ اس کے تحفظ اور اس کی توسیع کے لیے جان و مال کی قربانیاں تک دینے میں بھی کوئی "مضائقہ" نہیں ہے۔ لیکن یہ معاملہ صرف "عدم مضائقہ" یا اباحت و حلت پر بھی نہ رکا بلکہ دارالکفر میں مسلمانوں کی ضروریات نے جلدی ہی انھیں مجبور کرنا شروع کیا کہ اپنی نئی نسلوں کو خدمتِ کفر کا شوق دلانے کی کوشش کریں تاکہ ان نقصانات کی تلافی ہو جو اول اول کچھ مدت کے "مضائقہ" نے انھیں پہنچا دیا تھا۔ اس لیے ایک آخری دلیل یہ تصنیف کی گئی کہ مسلمانوں کی ترقی و فلاح، اور بعض حالات میں ان کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ نظامِ کفر کے عدالتی، تشریعی، انتظامی، فوجی، صنعتی، غرض تمام شعبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ورنہ امت کے وفات پا جانے یا کم از کم ترقی کی دوڑ میں غیر مسلموں سے پیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس دلیل نے بیک جنبشِ قلم اسی چیز کو جو کل تک صرف مباح کے مقام پر تھی فرض کے درجہ پر پہنچا دیا اور واجب ہو گیا کہ اگر ساری قوم نہیں تو اس میں سے ایک طبقہ تو اس فرض کے انجام دینے کے لیے ضرور نکلتا ہی رہے۔ گویا حکمِ الٰہی اب یوں قرار پایا کہ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الکفر ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یضلون، اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیز ویامرون بالمنکر وینھون عن المعروف۔

دین میں یہی وہ عظیم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے متقی و دیندار حضرات تسبیحوں کو گردش دیتے ہوئے وکالت اور منصفی کے پیشوں میں داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور کرائیں اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی تلاوت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحا و اتقیا کے بچے نئی درسگاہوں میں داخل ہوئے اور وہاں سے بے دینی و مادہ پرستی اور بداخلاقی کے سبق لے لے کر نکلے اور پھر اس نظامِ کفر کے صرف عملی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر معاملات میں اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت گزار بن گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداءً محض اوپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ مردوں سے گزر کر جاہلیت اور ضلالت اور بداخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا، وہی فرضِ کفایہ جسے ادا کرنے کے لیے پہلے مرد اٹھے تھے، عورتوں پر بھی عائد ہو گیا، اور ان بیچاریوں کو بھی آخر اس "دینی خدمت" کی بجا آوری کے لیے نکلنا پڑا، نہ نکلتیں تو خطرہ تھا کہ کہیں غیر مسلم ان سے بازی نہ لے جائیں!

اور کہیں یہ گمان نہ کر لیجیے گا کہ دین میں یہ ترمیم آج کچھ نئی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بنا آج صدیوں پہلے پڑ چکی تھی جبکہ تاتار کے کفار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ "نظامِ کفر میں اسلامی زندگی" کا نقشہ پہلی مرتبہ اسی دور کے علماء نے مرتب کیا تھا، بلکہ اسی زمانہ میں بڑے بڑے علماء و صلحاء نے خود نظامِ کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی، اور ان میں بکثرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارسِ عربیہ میں علماءِ دین و مفتیانِ شرعِ متین تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ غلطی ایک مقدس غلطی بن چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانہ کے فقیہ اور محدث اور مفسر سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلط بات نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں، جو ابتدائی اضطرار کی بنا پر "اسلام زیرِ سایۂ کفر" کے نظریہ سے شروع ہوا، پھر رفتہ رفتہ "نظامِ کفر کی خدمت

جائز ـــــ مستحب ـــــ فرضِ کفایہ" کے نظریہ تک پہنچا، اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطۂ نظر کی پستیوں میں جا گرا کہ "مذہبی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری عین مقتضائے دین ہے"۔ مسلمانوں کی کوشش یہ بھی رہی کہ اپنے تنزل کے ہر مرحلے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لیے دلیل بہرحال انھیں خدا کے دین ہی سے ملنی چاہیے۔ یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زعم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ "خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضامن ہے اس لیے جو ضرورتیں اب ہمیں پیش آ رہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے بھی اسی دین سے ہم کو رہنمائی ملنی چاہیے۔"
لیکن دراصل اس ظاہری فارمولے کے باطن میں جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ "جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے ایمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلے میں کم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے چلنے کے بجائے ہمارے پیچھے چلنا شروع کر دے۔ یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلہ میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انھیں پورا کرنے کی ضمانت لیتا جائے، بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس کی اقامت کا کام حتی کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی میں جس جس وادی کی خاک چھانتے پھریں اس میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہے اور جن جن ادیانِ باطلہ کے ہم تابع فرمان بنتے جائیں ان کے ماتحت ساری غلامانہ حیثیتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے، اور اس کے منشا کے خلاف جو جو طرزِ زندگی ہم قبول کریں ان میں پیش آنے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو۔" چنانچہ اسی غلط نقطۂ نظر کو لیے ہوئے ان لوگوں نے قرآن اور سنت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ ٹھہری تو وہ نہ سورۂ عنکبوت تھی نہ بقرہ، نہ آل عمران، نہ انفال، نہ توبہ بلکہ صرف سورۂ یوسف تھی اور اس کے بھی وہ مقامات جن سے خان بہادر صاحب استدلال فرما رہے ہیں۔ اسی طرح پوری سیرت نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قابلِ اتباع ملی تو وہ نہ مکے کی تپتی ہوئی ریت تھی، نہ طائف کی سنگ باری، نہ بدر و احد کے میدان بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے حبش گئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت رعایا بن کر رہی!

لیکن جو شخص مطلب جو ذہنیت نہ رکھتا ہو بلکہ طالبِ حق ہو اس کے لیے یہ سوال غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ درحقیقت سورۂ یوسف کے زیرِ بحث واقعات اور ہجرتِ حبشہ کے حالات سے بھی کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو یہ حضرات نکالنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہی نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ایک نظامِ کفر کی خدمت اور ایک غیر الٰہی قانون (دینُ الملک) کے اجراء و نفاذ کی ذمہ داری دینی غرض کے لیے قبول کی تھی کہ ایسا کرنا فی نفسہٖ مقصود تھا اور یہ کہ مسلمانوں نے مکے سے حبش کی طرف اسی بنیاد پر ہجرت کی تھی کہ ایک مسلم جماعت کے لیے ایک غیر مسلم نظامِ تمدن و سیاست بالکل ایک موزوں مقام ہے بشرطیکہ وہ مسجد میں اپنے منشا کے مطابق پوجا کر لینے کی اور اپنے سینے میں کچھ عقائد رکھ لینے اور زبان سے ان کے پھاگ اڑا لینے کی اس کو اجازت دے دے، تو اس کے بعد کچھ مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر کے سوال سے بھی بدرجہا زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ یہ بات مان لینے کے بعد تو یہی امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جو دین انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے نوعِ انسانی کے لیے بھیجا آیا وہ صرف عبادت گاہ کے لیے تھا یا پوری انسانی زندگی کے لیے؟

(۲) اور جو انبیاء اس دین کو لے کر آئے وہ سارے کے سارے ایک ہی مقصد کے لیے آئے تھے اور ایک ہی ان کا مشن تھا یا مختلف مقاصد اور مختلف مشنوں کے لیے، جن میں سے بعض مشن بعض کی ضد پڑتے ہوں؟

(۳) اور یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ فی الواقع کیا ہے؟ ـــــ اپنی پوری زندگی میں اس کی بندگی کرے اور اسی کے قانون کی

متابعت میں کام کرے یا صرف پوجا اس کی کرلے اور باقی اپنے سارے معاملات جن طریقوں پر چاہے چلائے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس کا تعلق صرف اُس محدود زندگی سے ہے جو آجکل کے تصور کے لحاظ سے "مذہبی" کہلاتی ہے۔ مگر یہ مان لینے کے بعد قرآن میں اور دوسری کتبِ آسمانی میں تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانونِ دیوانی و فوجداری، ضوابطِ شہادت و عدالت اور مسائلِ صلح و جنگ وغیرہ کے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ سب بے معنی قرار پاتی ہیں یا پھر ان کی حیثیت احکام کی نہیں بلکہ سفارشات کی رہ جاتی ہے، جن پر عمل ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو اللہ میاں کو کوئی خاص شکایت نہ ہوگی۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے اور ہو سکتا کیا معنی، آجکل عام طور پر نبوت کا تصور یہی ہے کہ مختلف انبیاء مختلف مشن لے کر آئے ہیں، حتیٰ کہ ایک نبی کا مقصد بعثت اگر یہ تھا کہ نظامِ کفر کو توڑنے کے لیے لڑے اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو زمین پر حکمران ہونے کی حیثیت سے قائم کرے تو دوسرے نبی کا مقصد بعثت اس کے برعکس یہ رہا ہے کہ نظامِ کفر کے اندر نہ صرف یہ کہ محدود قسم کی مذہبی و اخلاقی اصلاح پر اکتفا کرے، بلکہ اس نظامِ کفر کا مطیع و وفادار بن کر رہے اور موقع ملے تو اس کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے اپنی خدمات خود پیش کر دے۔ مگر یہ بات نہ قرآن کے بیان کے مطابق ہے جو پورے زور کے ساتھ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ سارے انبیاء کا مقصد بعثت ایک ہی تھا اور نہ عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی متضاد اور متصادم حرکات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی معقول آدمی بھی اُس خدا کو ایک حکیم خدا ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا جو انسانوں کی طرف اپنے پیغمبر کبھی کسی مقصد کے لیے بھیجے اور کبھی اس کے بالکل برعکس کسی دوسرے مقصد کے لیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نبی نظامِ اسلامی کو قائم کرنے کی جد و جہد میں کامیابی کے آخری مرحلوں پر پہنچ جائے، دوسرا بیچ کے کسی مرحلے میں یا ابتدائی مرحلہ ہی میں آخر وقت تک کام کرتا رہے اور کوئی تیسرا اپنی دعوت و تبلیغ یا جنگ کے بجائے کسی درمیانی صورت کو اپنے مخصوص حالات میں قابلِ عمل پا کر اسے اختیار کرے اور ان اشکال کے اختلاف کے باوجود مقصد سب کا ایک ہی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کو مکمل طور پر دنیا میں قائم کرنے کی سعی کرنا۔ لیکن اس اختلافِ اشکال کو یہ معنی پہنانا کہ انبیاء کے مقاصد بعثت ہی سرے سے مختلف و متضاد تھے، اللہ پر ایسا بہتان لگانا ہے جس سے بدتر بہتان شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح تیسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے، اور آج کل کے مسلمان بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی پوجا کر لیا کرے اور کچھ مسائلِ غسل و طہارت اور چند مخصوص حدودِ حلال و حرام کی پابندی کر لے، اس سے آگے اللہ کا کوئی مطالبہ نہیں ہے اور اللہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ آدمی زندگی کے وسیع تر معاملات میں اپنے نفس کے قوانین کی پیروی کرتا ہے یا ان شیاطینِ جن و انس کے احکام کی جو اس کی زمین پر مسلط ہو گئے ہیں۔ مگر یہ جواب موجودہ زمانہ کے دنیا پرستوں کے لیے خواہ کتنا ہی اطمینان بخش ہو اور خواہ "الدین یسر" اور "ما جعل علیکم فی الدین من حرج" کا یہ منشا قرار دے کر وہ اپنے لیے اس سے کتنی ہی سہولتیں پیدا کر لیں، بہرحال یہ تصورِ عبدیت و بندگی کے تصور کی قطعی نفی ہے۔ بندگی کا شاید اس سے زیادہ مضحکہ انگیز مفہوم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ بندہ چوبیس گھنٹوں میں سے دو گھنٹوں کے لیے بندہ ہو اور باقی اوقات میں آزاد، یا صرف فاقہ کی سلامی دے دینے پر اس کی بندگی ختم ہو جائے اور پھر سارے کام اسے اپنی اور دوسروں کی مرضی کے مطابق کرتے رہنے کی آزادی حاصل ہو۔ پھر وہ خدا تو ہرگز خدا مانے جانے کے قابل نہیں ہے جو ایک طرف اپنے آپ کو انسان کا خالق اور رب بھی کہتا ہو اور دوسری طرف پورے انسان کو نہیں بلکہ اس کے ایک نہایت قلیل اور غیر اہم جز تک اپنی آقائی و فرماں روائی اور اس کی بندگی و غلامی کو محدود رکھنے پر راضی ہو۔ کوئی باپ اپنے بیٹے پر اپنی پدرانہ حیثیت کو، کوئی شوہر اپنی بیوی پر اپنی شوہرانہ حیثیت کو، کوئی حاکم اپنی مملکت اور اپنی رعایا پر اپنی حاکمانہ حیثیت کو اس حد تک محدود کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہ چند مراسمِ اطاعت و وفاداری ادا ہو جانے کے بعد اس کی پدریت

اور شوہریت اور حاکمیت کا مقتضا پورا ہو جائے اور پھر بیٹے کو اختیار ہو کہ جس جس کو چاہے باپ بناتا پھرے اور عورت کو اختیار ہو کہ جس جس کو مناسب سمجھے وجہ سکون بنتی پھرے، اور رعایا کو اختیار ہو کہ جس جس کے قانون کی چاہے پیروی کرے، جس کو چاہے ٹیکس دے اور جس کے احکام کی چاہے اطاعت کرتی رہے۔ مگر یہ خدا آخر کیسا خدا ہے کہ جو انسان سارا کا سارا اس کا مخلوق اور اسی کا پروردہ، اور اسی کے بل پر قائم و موجود ہے، اس پر اپنی آقائی کو محدود کر لینے اور اس سے بندگی کی چند رسمی باتیں قبول کر کے اسے خود مختار یا ہر ایک کی غلامی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے پر راضی ہے۔

دین اور نبوت اور تقاضائے عبدیت کے یہ تصورات اگر صحیح نہیں ہیں اور فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا دین انسان کی ساری اجتماعی و انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور خدا کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہی ہے کہ وہ ہر حیثیت سے اس کے قانون کے پیرو اور اس کی ہدایت کے متبع ہو کر رہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اس برحق نظام زندگی کو قائم کرنے کی دعوت دیں اور اسی کی اقامت کے لیے سعی کریں جو خدائے واحد کی اطاعت پر مبنی ہو تو کسی معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا سخت مشکل ہے کہ سارے نبیوں میں سے تنہا ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہی انوکھی قسم کے نبی تھے جن کے سپرد دین اللہ کو قائم کرنے کی سعی کے بجائے یہ خدمت کی گئی تھی کہ دین الملک کے تحت وزارتِ مال کی نوکری کریں، اور نہ کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو عرب میں دینِ حق کی اقامت میں سعی و جہد بھی فرما رہے تھے اور دوسری طرف آپ کے نزدیک ایک غیر مسلم نظام حکومت بھی ایسا برحق تھا کہ ایک مسلم جماعت کے لیے وہ ایک مناسب جائے قیام ہو سکتا تھا۔ جو لوگ دین کو ایک معقول و متناسب نظام کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق اجزاء کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کے لیے تو یہ بہت آسان ہے کہ انبیاء کے حالات زندگی، قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و اوامر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جزء دوسرے جزء سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کر لے، لیکن اس دین کو ایک حکیم کے بنائے ہوئے مرتب و مربوط اور متناسب نظام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لیے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس دین کے ہر پہلو اور ہر جزء کی وہی تفسیر و تاویل اختیار کریں جو کلی نظام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو اور کسی ایسی تعبیر کو خواہ وہ کیسے ہی بڑے علماء کی طرف سے پیش کی گئی ہو، قبول نہ کریں، جس سے اس دین کے اندر تناقض، اور اس کی تعلیمات اور انبیاء علیہم السلام کے کاموں کے درمیان تصادم لازم آتا ہو۔

اب ہم سورۂ یوسف کے زیر بحث مقامات اور ہجرت حبشہ کے واقعات سے براہ راست بحث کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طریقے سے سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب قبل اس کے کہ نبوت سے سرفراز ہوتے، اپنے بھائیوں کی غداری اور ایک تجارتی قافلہ کی خیانت کی بدولت عزیز مصر کے مملوک ہو چکے تھے۔ اس مملوکیت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جب کہ آپ قید کیے جا چکے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا منصب عطا کیا گیا اور اغلب یہی ہے کہ یہ سرفرازی قید ہی کے زمانہ میں ہوئی ہوگی، کیونکہ قید ہونے سے پہلے آپ کے کلام کا انداز پیغمبرانہ شان کا نہیں بلکہ صرف ایک مرد صالح کا سا نظر آتا ہے۔

اس حالت میں جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے معاً اپنی پیغمبرانہ دعوت کی ابتدا کر دی اور ساتھ کے قیدیوں ہی کو اس چیز کی طرف بلانا شروع کر دیا جس کے لیے آپ مامور ہوئے تھے۔ اس دعوت کا خلاصہ سورۂ یوسف رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے جس کا مطالعہ کر کے آج بھی ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کا بلاوا "اربابٌ متفرقون" کی بندگی کی طرف نہیں تھا، بلکہ ایک رب کی بندگی کی طرف تھا اور وہ بار بار اہل مصر پر یہ واضح کرتے رہے تھے کہ جس بادشاہ کو تم نے رب بنا رکھا ہے وہ میرا رب نہیں ہے، بلکہ میرا رب اللہ ہے، اور جس ملت کی میں پیروی کرتا ہوں وہ اللہ ہی کی بندگی سے عبارت ہے۔ یہ تبلیغ جو وہ قید خانہ میں کر رہے تھے، اس کے دوران میں یکایک یہ صورتِ حال پیش آئی کہ دیانت و تقویٰ

اور حکمت و بصیرت کے جو غیر معمولی نشانات ان کی ذات سے ظاہر ہوئے تھے، فرماں روائے مصر ان سے متاثر ہو گیا اور اس حد تک متاثر ہوا کہ انھیں یہ توقع ہو گئی کہ اگر وہ سلطنت کے پورے اختیارات اس سے مانگیں تو وہ انھیں دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ کہ وہ اسلامی انقلاب کے لیے دعوتِ عام، جدوجہد، کشمکش اور جنگ کے طویل عمل ہی کو اختیار کریں، جو عام حالات میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ کہ وہ اس موقع کو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کے ہاتھ آگیا تھا، استعمال کریں اور عقیدت مند بادشاہ سے جو اختیارات مل رہے ہیں، انھیں لے کر ملک کے نظامِ فکر و اخلاق اور نظامِ تمدن و سیاست کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت ان کو عطا کی تھی اس کی بنا پر انھوں نے پہلے راستے کی بہ نسبت دوسرے راستے کو اپنے مقصد کے لیے مفید تر اور اپنی منزل مقصود سے قریب تر سمجھا اور اسے اختیار کر لیا۔ یہ غیر اسلامی نظام کی نوکری نہیں تھی جو پیٹ پالنے کے لیے یا ذاتی جاہ و منزلت کے لیے یا نظامِ فاسد کے اندر جزوی مصالح کے لیے کی گئی ہو، بلکہ یہ ایک تدبیر تھی جو اسی ایک مقصد کے لیے اختیار کی گئی تھی جس کے لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت یوسف بھی مبعوث ہوئے تھے۔

جن لوگوں نے اسے محض نوکری سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اس کو ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس غرض کے لیے حاصل کیا تھا کہ کافرانہ نظام بدستور قائم رہے اور وہ اس کے تحت بس فائنس منسٹر کی خدمت انجام دیتے رہیں، ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا مرتبہ موجودہ حکومتوں اور ریاستوں کے تنخواہ دار ملازموں سے کچھ بھی بلند نہیں ہے حتیٰ کہ اتنا بلند بھی نہیں جتنا ہمارے اس ملک میں کانگریسی وزارتوں کا مقام ثابت ہوا ہے جن کا طرزِ عمل تمام ملک دیکھ چکا ہے کہ جب تک انھیں اپنے مقصد (آزادیِ ملک) کے لیے وزارت کے مفید ہونے کا یقین نہ ہو گیا، انھوں نے اور ان کے کسی چھوٹے بڑے شخص نے بھی وزارت قبول کرنے کا خیال تک نہ کیا اور پھر جب وزارتیں قبول کیں تو یہ دیکھ کر کہ فی الواقع جوہرِ اقتدار (Substance of power) ان کی طرف منتقل نہیں کیا گیا ہے، انھوں نے تمام وزارتوں کو لات مار دی۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اختیارات بادشاہ سے مانگے گئے تھے یا اس سے چھینے گئے تھے اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت یوسف کے برسرِ اقتدار آتے ہی بادشاہ معزول کر دیا گیا یا تختِ سلطنت پر قائم رہا۔ اصل اہمیت جو چیز رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو منصب طلب کیا تھا وہ آیا کافرانہ نظام کو چلانے کے لیے اور اس کی ملازمت قبول کرنے کی خاطر کیا تھا یا اپنے مقصدِ بعثت یعنی نظامِ اسلامی کو قائم کرنے کی خاطر؟ دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ آیا فی الواقع ان کو ایسے اختیارات ملے تھے یا نہیں جن سے وہ ملک کے نظام میں تبدیلی کرنے کے قابل ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک دین اور نبوت کے پورے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حضرت یوسف کے مطالبہ "اجعلنی علی خزائن الارض" کا مقصد نظامِ اسلامی کا قیام سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خزائن الارض کے مطالبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ملک کے تمام ذرائع و وسائل (Resources) ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ خزائن کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ مالیات کے معنوں میں نہیں آیا ہے[1]۔ قرآنی آیات کا تتبع کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس لفظ کا مفہوم وہی ہے جو "ذرائع و وسائل" کا مفہوم ہے اور ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں کسی ملک کے تمام ذرائع و وسائل کا ہونا اور اس کا ملک کے تمام سیاہ و سپید پر متصرف ہو جانا دونوں بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی بات کی تصدیق توراۃ سے بھی ہوتی ہے جس میں بصراحت یہ بیان

[1] مثلاً آیت ولله خزائن السموات والارض - وان من شیء الا عندنا خزائنه - ام عندهم خزائن ربك - وقال الذين في النار لخزنة جهنم

ہوا ہے کہ فرعون مصر صرف برائے نام بادشاہ رہا ورنہ تمام ملک عملاً حضرت یوسف کے زیر نگیں ہو گیا۔[1]

اب رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی ملک میں دین الملک برقرار رہا جیسا کہ آیت "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک" سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عام طور پر اس کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مترجمین اس کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو نہیں پکڑ سکتے تھے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ یوسف کا یہ کام نہ تھا، یا یوسف کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے بھائی کو دین الملک کے تحت پکڑتا۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس محاورہ کا مفہوم عدم قدرت نہیں، بلکہ عدم موزونیت و عدم مناسبت ہی ہے۔ مثلاً ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب (آل عمران، رکوع ۱۸) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تم کو غیب پر مطلع نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے۔ اسی طرح ما کان اللہ لیضیع ایمانکم اور فما کان اللہ لیظلمھم اور ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ میں اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ ذکر ہے کہ ظلم اور اضاعت ایمان اور مومنین و منافقین کو خلط ملط چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کا طریقہ نہیں ہے۔ اور خود سورۂ یوسف میں اس آیت سے پہلے ایک مقام پر جو ارشاد ہوا ہے ما کان لنا ان نشرک باللہ من شیء تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں"۔ پس آیت زیر بحث کو بھی یہ معنی پہنانا صحیح نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے، بلکہ قرآنی استعمالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار کرنا یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہیں تھا۔ البتہ اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحب اقتدار ہونے کے باوجود کم از کم فرعونی قانون تعزیرات سات آٹھ برس بعد تک (جب کہ حضرت یوسف کے بھائی وہاں پہنچے تھے) ملک میں نافذ تھا۔ لیکن اس کے متعلق اس سے پہلے بھی ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو ایک رات کے اندر کلی طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی انقلاب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اقتدار ہاتھ میں آتے ہی جاہلیت کے تمام قوانین و رسوم کو یک لخت بدل ڈالا جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ملک کے نظام تمدن کو کلی طور پر تبدیل کرنے میں پورے دس برس لگے تھے۔ لہٰذا اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں چند سال تک فرعونی قانون تعزیرات یا اس کے ساتھ کچھ دوسرے فرعونی قوانین بھی جاری رہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر خدائی قوانین کا اجراء سرے سے تھا ہی نہیں اور وہ فرعونی قوانین ہی ملک میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

---

[1] "سو فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کہ کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے جس میں خدا کی روح ہے، مل سکتا ہے؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے اس لیے تیرے مانند دانشور اور عقلمند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا:: اور اس نے اسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسف سے کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔" (پیدائش باب ۴۱ آیت ۳۸ تا ۴۴۔)

خط کشیدہ فقرے صریح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدتمند ہو چکا تھا اور اگرچہ اس نے آپ کی نبوت تسلیم نہیں کی تھی، تب بھی وہ پہلی ہی ملاقات میں ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کے سات آٹھ برس بعد جب حضرت یوسف کے بھائی مصر پہنچے ہیں تو حضرت یوسف ان سے کہتے ہیں

"پس تم نے نہیں، بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے گویا فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا حاکم بنا دیا۔ سو تم جلد میرے باپ کے پاس جا کر اس سے کہو تیرا بیٹا یوسف یوں کہتا ہے کہ خدا نے مجھے سارے ملک مصر کا مالک کر دیا ہے" (پیدائش، باب ۴۵ آیت ۸ تا ۹)

اب ہجرت حبشہ کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس معاملہ کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حبش میں ایک غیر مسلم حکومت قائم تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہاں بھیج دیا تاکہ اس کی رعیت بن کر رہیں۔ پھر صحابہ کرام وہاں غیر مسلم بادشاہ کے وفادار بن کر رہے کیونکہ انھیں اس کے ماتحت عقیدے اور پوجا کی آزادی حاصل تھی، اور جب ایک ہمسایہ بادشاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے اس کی فتح یابی کے لیے دعائیں مانگیں۔ لیکن یہ واقعات کی بالکل غلط نقشہ کشی ہے۔ اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبش بھیجا تھا اسی وقت آپ کو اس امر کا اندازہ تھا کہ نجاشی صالحین نصاریٰ میں سے ہے، چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ نے مہاجرین سے اس کی مملکت کے متعلق فرمایا تھا وھی ارض صدق۔ دوسرے مہاجرین کو وہاں بھیجنے کی غرض یہ نہ تھی کہ وہاں کی رعایا بن کر رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو ہجرت کا مشورہ دیتے وقت یہ فرمایا تھا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ حتی یجعل اللہ لکم فرجًا ومخرجًا "کاش تم لوگ حبش کی طرف چلے جاتے یہاں تک کہ اللہ تمھارے لیے کوئی صورت نکالے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ جو مسلمان کشمکش کے اس مرحلہ میں اپنی قوت برداشت سے زیادہ مصائب کے شکار ہو رہے تھے ان کو آپ نے عارضی طور پر ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں اس قسم کے مصائب کی توقع نہ تھی اور مقصود یہ تھا کہ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ لوگ وہاں سے واپس آجائیں۔ اس کو نظیر بنا کر یہ نتیجہ نکالنا آخر کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی غیر مسلم حکومت میں عقیدہ اور پوجا کی آزادی حاصل ہو تو یہ اس کے تحت ان کے وفادار رعیت بن کر رہ پڑنے کے لیے کافی ہے اور اس کے آگے کچھ اور مطلوب نہیں۔ پھر جب مہاجرین وہاں پہنچے اور کفار مکہ نے نجاشی سے ان کو واپس مانگنے کے لیے اپنا وفد روانہ کیا اور حضرت جعفر اور نجاشی کے درمیان مکالمہ ہوا تو محدثین اور اہل سیرت کی متعدد روایت کے مطابق نجاشی نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اس عقیدہ کی تصدیق کی جو قرآن میں بیان ہوا ہے، بلکہ مزید براں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی اقرار کیا۔ اس کے بعد نجاشی کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ امام احمد نے عبد اللہ ابن مسعود کے حوالے سے (جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں) نجاشی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ اس نے کہا مرحبا بکم ولمن جئتم من عندہ اشھد انہ رسول اللہ وانہ الذی نجد فی الانجیل وانہ الرسول الذی بشر بہ عیسی ابن مریم۔ کیا یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں؟ اور بیہقی میں خود عمرو بن عاص سے جو مہاجرین کو واپس لانے کے لیے کفار مکہ کی طرف سے حبش بھیجے گئے تھے، یہ الفاظ مروی ہیں کہ انھوں نے اہل مکہ کو جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ ان اصحمۃ یزعم ان صاحبکم نبی۔ کیا کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر کے بھی غیر مسلم قرار پا سکتا ہے؟ ان روایات سے بڑھ کر معتبر و مستند روایت یہ ہے جو بخاری و مسلم میں ملتی ہے کہ اس شخص کی وفات کی خبر پا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور فرمایا مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمۃ "آج ایک مرد صالح نے وفات پائی ہے، اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھو"۔ اس کے بعد تو سرے سے اس استدلال کی بنا ہی منہدم ہو جاتی ہے جو ہجرت حبشہ کے واقعہ سے کیا جاتا ہے۔

خان بہادر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں جماعت اسلامی اور اس کی دعوت اور اس کے کام پر جو اعتراضات فرمائے ہیں ان کے جواب میں کچھ کہنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ ان باتوں کو اس سے پہلے وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کی تنقید میں بیان فرما چکے ہیں اور ان کا جواب بھی میں اس تنقید کے جواب میں عرض کر چکا ہوں (ترجمان القرآن بابت [illegible]) لیکن آج

وہ ان ساری باتوں کو پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا کبھی ان کا جواب دیا ہی نہیں گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے طرزِ فکر سے ان کا اور ان کی طرح سوچنے والے لوگوں کا طرزِ فکر بالکل مختلف ہے اور ہماری بات ان کی سمجھ میں اس طرح نہیں آسکتی جس طرح ان کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جن سوالات کو وہ اہمیت دے کر بار بار ہمارے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اصل سوالات وہ نہیں ہیں، بلکہ بنیادی سوال صرف یہ ہے کہ دینِ اسلام کا اصل مطالبہ اپنے پیرووں سے کیا ہے اور امت مسلمہ کا حقیقی مشن کیا ہے جس کی خاطر اس کو ایک مستقل امت بنایا گیا ہے۔ جب تک اس مسئلہ میں ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر کا اختلاف باقی ہے اس وقت تک ناگزیر ہے کہ راہِ عمل کے ہر قدم میں وہ ہمارے اور ہم ان کے مخالف رہیں اور ہمارا ہر عمل ان کے نزدیک بے عملی اور ان کا ہر عمل ہمارے نزدیک بے عملی یا بدعملی رہے۔ پس فروع اور شاخوں پر ہم سے جھگڑنے میں وہ خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا اور ہمارے ناظرین کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ان کو پہلے اصول سے بحث کرنی چاہیے اور جب اصول پر وہ اور ہم متفق ہو جائیں تب کہیں ہمارے اور ان کے درمیان یہ بات زیرِ بحث آسکتی ہے کہ امت مسلمہ کے حقیقی مشن کو پورا کرنے کے لیے وہ طریقہ کتاب وسنت کے مطابق ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے یا وہ طریقہ جس پر خان بہادر صاحب اور ان کے طرزِ فکر کے لوگ اب تک کاربند رہے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

مرکزِ جماعتِ اسلامی سے خط وکتابت کرتے ہوئے ارکانِ جماعت اور دوسرے کرمفرما ازراہِ عنایت حسبِ ذیل امور کا لحاظ رکھیں:

(۱) اپنے ہر خط میں لازماً پورا پتہ نہایت صاف لکھیے۔

(۲) مرکز کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے امور کو یکجا لکھنے کے بجائے علٰحدہ علٰحدہ سلپوں پر لکھیے اور ہر سلپ پر پورا پتہ درج کیجیے ورنہ نہ صرف یہ کہ تعمیل میں دیر ہوگی اور ہمارا وقت ضائع ہوگا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ خط کے بعض حصوں کی تعمیل سرے سے ہو ہی نہیں۔

(۳) اپنے مدعا کو کم سے کم الفاظ میں بالکل سادہ طریقہ سے تحریر فرمایئے۔ طویل عبارت آرائی کی وجہ سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خود آپ ہی کا نقصان ہے۔

نوٹ:۔ مرکز کے مختلف شعبوں کے دائرۂ کار کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شعبۂ استفسارات، علمی، دینی، فقہی مسائل کے علاوہ تحریکِ اسلامی کے متعلق اصولی مسائل کا جواب دیتا ہے۔

(۲) شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی، جماعت کے دستور، شرائطِ رکنیت، شمولیت جماعت، رفتارِ کار، رفتارِ تنظیم وغیرہ امور کے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ نیز ارکین اور مقامی جماعتوں کے لیے کام کا پروگرام متعین کرنا۔ ان کی رپورٹیں جمع کر کے ہدایات دینا اور اجتماعات کے متعلق جملہ امور طے کرنا اسی شعبہ کا کام ہے۔

(۳) مکتبہ جماعت اسلامی، جماعتی لٹریچر کی اشاعت کا کام کرتا ہے۔ کتابوں کے آرڈر مکتبہ ہی کے نام آنے چاہئیں، نیز جماعت کے پورے اشاعتی کام کے متعلق اسی دفتر کو مخاطب کیا جائے۔

۴۔ دفتر ترجمان القرآن کو صرف رسالہ سے تعلق رکھنے والے امور کے لیے مخاطب کیا جائے۔

علامہ موسیٰ جار اللہ کا ایک مراسلہ

ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ و جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ میں مشہور ترکی عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کی بعض کتابوں پر میرے قلم سے تنقیدیں نکلی تھیں۔ ان کے متعلق پہلے علامہ کے بعض قدردانوں کے خطوط آئے اور پھر خود علامہ کا ایک طویل مراسلہ مدیر ترجمان القرآن کو اس مطالبہ کے ساتھ موصول ہوا کہ یہ ترجمان میں شائع کر دیا جائے۔ یہ مراسلہ عربی میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے اور جہاں کہیں مجھے کسی بات کی توضیح یا کسی غلط فہمی کے ازالہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اس کو میں نے نیچے فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے۔ علامہ کے مراسلہ کا عنوان ہے "امت کو اللہ کی کتاب سے وہم احتیاط کی بنا پر محروم نہ کرو"۔ پورے مراسلہ کا ترجمہ درج ذیل ہے اور حتی الوسع اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ علامہ موسیٰ جار اللہ جو کچھ فرمانا چاہتے ہیں وہ بے کم و کاست لوگوں کے سامنے آ جائے۔ یہاں تک کہ اسی خیال کی وجہ سے ترجمہ کی خوبیوں سے زیادہ نفس الفاظ کی رعایت کرنی پڑی ہے۔

امین احسن اصلاحی

وانه لكتاب عزيز لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد (۴۱: ۴۲)

اور یہ ایک کتاب عزیز ہے جس میں نہ باطل اس کے آگے سے داخل ہو سکتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔ ایک حکیم و حمید کی اتاری ہوئی ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اتارنے میں جو حکمت ملحوظ رکھی ہے اپنے دعوائے احتیاط کو اس سے زیادہ محکم اور اس کی کتاب کی حفاظت کے باب میں اس کی عزت و مجد سے زیادہ قوی نہ قرار دو۔

میں نے علوم قرآن کے بعض ابتدائی مباحث پر چند کتابیں لکھیں۔ پھر اللہ کی مدد سے ان کو چھاپ کر شائع کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے ہندوستان کے مدارس کو دیکھا کہ انھوں نے قرآن کی تعلیم کو چھوڑ رکھا ہے اور قرآنی علوم و مطالب ان کے نصاب تعلیم سے بالکل خارج ہیں۔ میں نے یہ کتابیں طلبہ کے استفادہ کے لیے شائع کیں نہ کہ مدارس کے اساتذہ اور ہندوستان کے علماء کے لیے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان کے علماء حضرات بڑے لوگ ہیں۔ دوسروں کے علوم و فنون سے بالکل مستغنی اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس میں سرمست۔ میں نے ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں پایا جو دوسرے کی سچی بات اور صائب فکر کو قبول کر سکتا ہو اور کسی کو بھی نہیں پایا جو تعلیم و افادہ کی مسند پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھنے لگتا ہو اور دوسرے کی کسی کوشش کی کما حقہ قدر کر سکتا ہو۔

ان کے آپس میں شدید اختلافات و نزاعات ہیں جن کے سبب سے باہم خوب جوتیوں میں چلتی رہتی ہے اور ایسی حقیر باتوں پر، جن کا امت کی صلاح و فلاح اور اس کی مذہبی و علمی خدمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بڑی بڑی معرکہ آرائیاں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ حالانکہ ضرورت و اہمیت کے اصلی مسائل میں یہ لوگ بالکل چپ سادھے ہوئے ہیں۔

علمائے ہند کو اس بات کی طرف بھی ذرا توجہ نہیں ہے کہ کسی مسئلہ نزاعی کا کوئی آخری اور قطعی حل پانے کی کوشش کریں کہ یا تو امت کسی ایک بات پر متفق ہو جائے یا ان چند پہلوؤں کے جواز پر متفق ہو جائے جن کی وجہ سے اس مسئلہ نزاعی پر ہنگامے برپا ہیں۔ میں نے تو نہ سنا اور نہ کبھی دیکھا کہ

کوئی مسئلہ، جو اسلام کے مختلف اسکولوں اور علما میں مختلف فیہ ہو، اہل علم کی مجالس یا کتابوں کے صفحات میں اس قصد سے مذاکرہ و تحقیق کی بساط پر لایا جائے کہ تبادلۂ خیالات اور تعاون آرا و افکار کی مدد سے اس کا قطعی اور فیصلہ کن حل پیدا کیا جائے یہاں تک کہ وہ مسئلہ ایک استخوان نزاع ہونے کی بجائے ایک متفق علیہ مسئلہ بن جائے۔[1]

میں نے یہ چیز نہیں پائی، حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ ایسا ہونا نہایت ضروری تھا۔ بے شبہ دین کے مختلف طریقوں اور زندگی اور افکار و خیالات کی مختلف راہوں کا اختلاف ناگزیر اور تقدیر الٰہی سے ہے لیکن یہ مقصود خداوندی نہیں ہے۔ بلکہ یہ چیز تو اس بات کا وسیلہ بنائی گئی تھی کہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں آرا و افکار ترقی کریں کہ لوگوں کے لیے اتفاق و اتحاد کا نقطہ پیدا کریں تاکہ لوگ اس چیز پر مجتمع ہو جائیں جو اصلح و اوفق ہے۔

یہ چیز میرے عقیدے میں، تمام مسائل مہمہ میں ضروری تھی اور امت کے فرائض میں داخل۔ اگر مسلمان فقہی مذاہب میں مختلف ہیں (مثلاً بسم اللہ کے جہراً پڑھنے یا آمین بالجہر یا رفع یدین یا اشارۂ تشہد یا ہاتھ چھوڑنے یا قنوت فجر و وتر یا کلمات اقامت وغیرہ کے باب میں) تو اس طرح کے اختلاف میں چنداں ہرج نہیں تھا۔ اس طرح کے اختلافات کا برابر قائم رہنا بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ ساری باتیں جائز ہیں اور سب پر سنت کے دلائل موجود ہیں۔ لیکن ایسے مسائل میں اختلاف، جن کا تعلق قرآن کریم یا اس کی آیات کے معانی سے ہے، نہایت اہم چیز ہے اور اس کا دوام کسی طرح جائز نہیں ہے بلکہ امت اور ائمہ امت پر فرض ہے کہ ان کا ایسا قطعی حل دریافت کریں جس پر پہلے اہل علم اتفاق کریں اور بالآخر ان پر ساری امت میں اتفاق ہو جائے۔ میرے نزدیک یہ بات ممکن بلکہ نہایت سہل و آسان ہے۔

ہمارے اختلافی مسائل میں ایسے اہم اور عظیم الشان مسائل ہیں جن میں اختلاف ہونا کتاب کریم کی عظمت اور اسلام کے شرف کے خلاف ہے اور اگر بالفرض ان میں اختلاف واقع ہو گیا ہے تو اس اختلاف کا باقی رہنا شرف اسلام کے منافی ہے۔

---

[1] علامہ نے ان سطور میں علمائے ہند کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ملامت و تحقیر کے وہ سزاوار ہیں لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم اتنی گذارش ضرور کریں گے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علما نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالم اسلامی کے علما کا حال یکساں ہے۔ ہر جگہ کے مدارس میں قرآن متروک و مہجور ہے، ہر جگہ اس گروہ میں انانیت، کبر اور خود پرستی کی وہی بیماریاں ہیں جو علامہ کو یہاں کے علما میں نظر آئی ہیں۔ علم و تحقیق کی خواہش اور اس کی قدر و حق شناسی بھی ہر جگہ مفقود و معدوم ہے اور تبادلۂ افکار اور تعاون آرا کے ذریعہ رفع نزاع اور تحقیق کی تمنا جو علامہ نے ظاہر فرمائی ہے اس کا بھی کہیں سراغ نہیں لگتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کے علما اپنے انجام کو پہنچ گئے اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقدر تھی وہ ان کو مل چکی۔ اب شاید صرف ہندوستان ہی باقی رہ گیا ہے جہاں فیصلہ کی آخری گھڑی ابھی نمودار نہیں ہوئی ہے اور گو بظاہر حالات کوئی ابھی پیشگوئی تو یہاں کی نسبت بھی نہیں کی جا سکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہاں دوسرے ممالک کے اعتبار سے حالات پہلے بھی بہتر رہے ہیں اور اب بھی بہتر ہیں۔ یہاں ابتدا سے صالح الفکر علما کا بھی ایک گروہ رہا ہے جس نے علم و تحقیق کی راہوں میں بھی نہایت قیمتی خدمات انجام دیں اور اصلاح فکر اور اقامت دین کی جدوجہد کی بھی طرح ڈالی۔ یہ گروہ تعصب اور تنگ نظری سے بھی پاک تھا اور اس نے ہر صحیح خدمت علم و دین کی قدر کی خواہ وہ کسی گروہ اور کسی ملک کے علما کے ہاتھوں انجام پائی ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ علامہ اگر انصاف سے غور کریں گے تو وہ ہندوستان کی اس امتیازی خصوصیت کو خود محسوس فرمائیں گے اور یہ بات ان کے جیسے بلند پایہ عالم کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ محض ترجمان القرآن کے تنقید گار کی "بے دانشی" کی بنیاد پر ہندوستان کے سارے علما پر وہ فتویٰ لگا دیں جو انھوں نے لگایا ہے۔ ہم ان کو اس سے ارفع سمجھتے ہیں کہ ان کی کسی بات میں قومی و نسلی تفاخر کی بو ہو کیونکہ یہ چیز اسلامی روح کے منافی ہے۔

اسی احساس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھکو ہدایت دی کہ میں نے چند کتابیں لکھیں پھر اللہ ہی کی مدد سے ان کو چھاپا اور شائع کیا۔ ان کتابوں میں نہایت اہم مسائل ہیں۔ بلا مبالغہ سو سے زیادہ۔ یہ سارے مسائل قرآن کریم سے متعلق ہیں اور ان سب کے بارہ میں علماء میں، قدیم زمانہ سے نہایت شدید اختلافات برپا رہے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان مسائل کے قطعی حل کے لیے کوشش کی تاکہ ان شبہات کا قلع قمع ہو سکے۔

۱۔ ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ قرآن مجید کے عہد نبوت میں جمع و ترتیب اور عہد خلافت راشدہ (زمانہ حضرت صدیق و فاروق و عثمان رضی اللہ عنہم) میں اس کے نقل و کتابت کا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں مسئلے تمدن انسانی کی تاریخ کے نہایت اہم مسائل اور آغاز اسلام کے عظیم ترین واقعات میں سے ہیں۔[1]

۲۔ دوسرا مسئلہ قرأت سبعہ کا ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ حروف سبعہ والی حدیث کے بارہ میں زمانہ قدیم سے ایسا شدید اختلاف ہے کہ کسی دوسرے اہم مسئلہ میں اس طرح کا اختلاف واقع نہیں ہوا۔ کتابوں میں اس کے متعلق چالیس اقوال ملتے ہیں لیکن کسی کتاب میں حروف کے معنی نہیں سمجھے گئے اور نہ کسی نے اختلاف صحابہ کے سلسلہ میں کسی ایسے حرف کا ذکر کیا جس میں اختلاف واقع ہوا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فی نفسہ اس اختلاف پر کبھی خفگی نہیں ظاہر فرمائی البتہ اس باب میں ایک کو دوسرے پر جب اعتراض ہوا تو اس پر آپ نے خفگی ظاہر فرمائی۔ آنحضرت صلعم ہر صحابی کو اسکی قرأت پر باقی رکھتے تھے۔ تفسیروں اور شروح احادیث میں اس کے متعلق ہمیں کوئی ایسی تفصیل نہیں ملتی جس پر مسلمانوں کا دل مطمئن ہو سکے اور تمام امت کا عقیدہ اس پر جم سکے۔ سب سے زیادہ حقیقت سے دور جو چیز اہل علم کی کتابوں میں مجھے نظر آئی وہ اس بات پر اجماع کا دعویٰ ہے کہ جن سات قراتوں (حروف) پر قرآن کریم نازل ہوا ہے ان میں سے چھ منسوخ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ قرأت سبعہ پر قرآن کریم کو نازل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (بے شک ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

جن لوگوں کو سرے سے اس بات کا پتہ بھی نہیں کہ حروف سبعہ ہیں کیا اور حروف کے کیا معنی ہیں انھیں یہ دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے کہ سات میں سے چھ قرائتیں منسوخ ہو گئیں۔[2]

۳۔ تیسرا مسئلہ قرآن کریم کی آیات کے نسخ کا ہے۔ یہ مسئلہ بھی نہایت مشہور اور غایت درجہ اہمیت رکھنے والا ہے۔ اصول فقہ اور تفسیر کی

---

[1] علامہ نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے ہم نے اپنی تنقید میں اس کی تعریف کی ہے ہمارے الفاظ یہ ہیں "ترتیب قرآن کی جو تاریخ مصنف نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ ہمیں مصنف کی بعض دلیلوں سے اختلاف ہے۔" ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے باوجود علامہ کی یہ بدگمانی کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ محض تنگ نظری اور انانیت کی بنا پر ان کی کوشش کی تحقیر کی گئی

[2] اس بحث کے متعلق ہم نے لکھا تھا کہ "یہ رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔" اور کوئی صاحب علم بھی اس کو پڑھکر شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ہم یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ قرأت ستہ بھی اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح وہ قرآن جو امت کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا اس کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ عہد نبوت اور خیر القرون ہی میں امت کو ایک نسخہ، ایک ترتیب اور ایک ہی قرأت پر مجتمع کر دیا جائے اور یہ کام بہترین ہاتھوں اور بہترین طریقہ پر انجام پا گیا اور امت کے تواتر نے اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ ہماری کتب تفسیر میں جو اختلاف قرأت مذکور ہے وہ ہمارے نزدیک بیشتر تاویل کا اختلاف ہے یعنی بعض آیات یا کسی لفظ کے معنی کو صحابہ اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں اس کو عین قرآن یا تواتر کا درجہ دینے میں ہمیں سخت تامل ہے اور اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس میں سخت فتنے پوشیدہ ہیں۔

کتابوں میں اس پر زمانہ قدیم سے معرکہ آرائیاں ہیں لیکن آج تک اس نزاع کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اتقان میں ۲۱ آیتیں منسوخ ہیں، اور انھوں نے لکھا ہے کہ پانچ آیتوں کے منسوخ ہونے پر اجماع ہے اور ان پانچ کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس مبحث پر میں نے ایک کتاب لکھی اور ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں بھی نسخ ثابت نہیں ہے۔ نہ باعتبار نظم، نہ باعتبار معنی[1]

۴۔ چوتھا مسئلہ آیات قرآن میں شاذ پہلوؤں سے متعلق ہے[2]

یہ سارے اساسی اور اہم مسائل اور اس قبیل کے دوسرے مسائل میں نے اہل علم کے سامنے اس قصد سے پیش کیے تاکہ آراء و افکار کے توارد و تبادلہ سے ان کو حل کیا جائے[3] اور میں نے ان کا آخری اور قطعی حل پانے کی کوشش کی اور میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں اور اس کا شکر گذار ہوں کہ طلب صادق اور اخلاص کامل کے ساتھ جد و جہد کرنے کی وجہ سے میں نے ان مسائل مہمہ میں سے اگر کل میں نہیں تو اکثر میں وہ سب کچھ پا لیا جس کا طلب گار تھا۔ انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ اور میرا کیا گناہ ہے اور میں نے کیا جرم کیا ہے اور کون مجھ کو الزام دے سکتا ہے اگر میں کہیں چوکا ہوں یا کسی بات کے حل کرنے سے عاجز رہا ہوں بشرطیکہ میں نے اس کے لیے کوشش کی ہے!

جو حضرات تعلیم و ارشاد کی مسندوں پر بیٹھے ہیں اور اپنے تئیں اس سے ارفع سمجھتے ہیں کہ کتاب کے صفحات پر ایک اچٹتی نظر بھی ڈال لیں اگر وہ غرور اور گھمنڈ کے ساتھ، اس کو ایک ترچھی نگاہ سے دیکھ کر، ملامت انگیز لب و لہجہ میں کہنے لگیں کہ "تو نے جھک مارا، اور ایک سعی لاحاصل میں سر کھپایا" تو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔ میں اس بو الفضولی سے شریفانہ درگذر کروں گا، اور ٹھنڈے دل سے یہ عرض کروں گا کہ میرا فرض صرف کوشش کرنا تھا، کسی نتیجہ تک پہنچنا انسان کے بس میں نہیں ہے[4]"

---

[1] علامہ کی یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری ہے اس وجہ سے ہم اس کے حسن و قبح سے بالکل بے خبر ہیں۔ لیکن ہم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں، اور جو لوگ اس کے منکر ہیں ان کو ہدایت کا منکر سمجھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس چیز سے ان کا فرار محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ نہ محل نسخ سے واقف ہیں اور نہ اس بات کو سمجھے ہیں کہ نسخ خدا کی ضروریات میں سے نہیں بلکہ بندوں کی ضروریات میں سے ہے اور حکمت تعلیم و مصلحت تدریج اس کی مقتضی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کے محیط ہونے پر اس سے ہرگز کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ [2] اس بحث سے اگر وہی بحث مراد ہے جو کتاب میں الوجوہ الشاذہ کے عنوان سے موجود ہے تو ہماری دلی خواہش یہی ہے کہ کاش علامہ اس بحث کو نہ لکھتے۔ [3] علامہ مراسلہ کے شروع میں یہ فرما چکے ہیں کہ "میں نے یہ کتابیں طلبہ کے استفادہ کے لیے شائع کیں، نہ کہ مدارس کے اساتذہ اور ہندوستان کے علماء کے لیے، میں جانتا ہوں کہ ہندوستان کے علماء حضرات بڑے لوگ ہیں۔ الخ" یہاں وہ اپنی تصنیف کی وجہ اس سے بالکل مختلف بتاتے ہیں [4] علامہ کی یہ آزردگی بالکل بے سبب ہے۔ ہم نے کہیں بھی ان کی اس ساری جد و جہد کو سعی لاحاصل نہیں قرار دیا ہے۔ ہم نے سعی لاحاصل اس جد و جہد کو قرار دیا ہے جو علامہ نے نزولی ترتیب کے اسرار بیان کرنے میں صرف فرمائی ہے، اور اس کے سعی لاحاصل قرار دینے کے بھی معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ علامہ اس سلسلہ میں نکات و لطائف نہیں پیدا کر سکے ہیں بلکہ اس کو لاحاصل قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ترتیب دین میں معتبر نہیں ہے چنانچہ علامہ نے آگے چل کر اس مراسلہ میں بھی اس کا اقرار فرمایا ہے کہ "تلاوت، کتابت، طباعت اور استدلال میں اعتبار مصاحف کی ترتیب کا ہے نہ کہ نزولی ترتیب کا" پس جو ترتیب دین میں معتبر نہیں ہے اور جس کے صحیح علم کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اگر کوئی ذہین آدمی صحیح و سقیم روایات کی مدد اور اٹکل کے تیر تکے چلا کر کوئی ترتیب کھڑی کر دے اور پھر اس کے اسرار و نکات بیان کرے تو اس کی ذہانت کی داد تو ضرور دی جا سکتی ہے کہ وہ بے جوڑ چیزوں میں بھی جوڑ ملا سکتا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی سعی لاحاصل ہی کہی جائے گی کیونکہ نہ تو دین میں اس ترتیب کا اعتبار ہے اور نہ اسی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جو عمارت کھڑی کی ہے وہ فی الحقیقت کسی اساس پر قائم ہے

جو شخص ان مسائل کو اہمیت دیتا ہے، اور منصف بھی ہے اس کو البتہ یہ بات معلوم ہوگی کہ یہ کتاب ان چاروں اہم مسئلوں کو نہایت سہل طریقہ پر ایک قطعی اور فیصلہ کن صورت میں پیش کرتی ہے اور ان کا مولف اپنی اس سعی کے صلہ میں کسی چیز کا طالب نہیں ہے اگرچہ زمین کے برابر اس کو سونا دیا جائے اور اس کے ساتھ اس کے مثل اور بھی۔ اور اسی کے برابر اس دنیا کے اعلیٰ ترین نفائس بھی۔

میں نے اس کتاب کا نام ترتیب السور رکھا اور اس نام میں نہ کوئی افتخار و ادعا مضمر ہے اور نہ کسی برتری کا گھمنڈ ہے۔ سورتوں کی ترتیب علوم قرآن کے سلسلہ کی سب سے ابتدائی چیز ہے۔ میں پہلے مسلمان بچوں کو علوم قرآن کی دعوت دیتا ہوں پھر ان کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ قرآن حکیم کے معانی کا مشاہدہ براہ راست روئے مصحف کے جمال میں کریں اس طرح کہ وہ ان کے سامنے ہر بیان و روایت اور تفسیر و تاویل کے غبار سے بالکل صاف ہو اور اس پر کسی قسم کا بھی کوئی حجاب نہ ہو۔

میں اللہ کی کتاب کی طرف ایک بصیرت کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی اور وہ بھی جن کی ہدایت سے میں نے ہدایت اور جن کے طریقہ سے میں نے رہنمائی حاصل کی۔ میری مراد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہے اور انہی کی رہنمائی کی پیروی کی رسول اللہ کے خلیفہ صدیق اکبرؓ نے اور زید بن ثابتؓ نے پھر تمام صحابہ نے ان کے بعد۔

پس اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس پر اجماع ہے تو اس کو اس دعویٰ کا حق ہے۔ یہ اجماع اللہ کی تائید اور روح القدس کی من جانب اللہ تصدیق سے ہوا۔

ترتیب سور کی فصل میں میں نے ترتیب نزول اور ترتیب مصاحف (۱۲ : ۱۹) نہایت واضح ایجاز اور خوبصورت اجمال کے ساتھ پیش کی ہے جس سے تمام ضروری تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ اور ترتیب نزول عقیدہ اہل اسلام میں قدیم ترین اور ثابت ترین ترتیب ہے کیونکہ نزول اللہ کے علم سے ہوا اور ترتیب نزول اللہ کے ارادہ سے ہوئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سورہ اللہ سے اس کی ترتیب کے ساتھ پاتے تھے اور تمام صحابہ کرام نے پورے زمانہ نزول میں، جو ۲۳ سال کی مدت پر مشتمل ہے، ترتیب نزول کا مشاہدہ کیا ایسا مشاہدہ جس کو کوئی انسان بھی بھول نہیں سکتا۔ صحابہ کرام سے کبار تابعین نے اس علم کو اخذ کیا، اور وہ علی الاطلاق اعدل امت اور ان تمام چیزوں کی حفاظت کے نہایت شائق تھے جن کو کتاب الٰہی سے کوئی علاقہ تھا۔ ان حضرات کی تعریف میں خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "ہر خلف کے عادلین اس علم کے حامل ہوں گے۔"

سب سے پہلا علم جس کو قرآن حکیم سے تعلق ہے ترتیب نزول کا علم ہے جس کا صحابہ کرام نے مشاہدہ کیا اور جس کو ان سے تابعین نے اخذ کیا اور پھر ہر قرن کے ثقات و عادلین اس علم کے حامل ہوتے رہے اگرچہ بعد کی صدیوں میں مدارس نے اس کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ نزول قرآن اللہ کے علم سے ہوا اور ترتیب نزول اللہ کے ارادہ سے ہوئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سورہ و آیت، جو نازل ہوتی تھی، اس کی ترتیب کے ساتھ پاتے تھے۔ صحابہ کرامؓ اس پورے زمانہ نزول میں اس کی ترتیب نزول کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ اس طرح کے مشاہدہ کو کوئی انسان بھول ہی نہیں سکتا۔ پھر اس علم کو تابعین نے لیا۔ اس کی حفاظت کی اور اس کو ضبط کیا۔ اور تابعین میں سے کسی کے حفظ میں کسی طرح کا وہم اور خلل نہیں تھا۔ اور ایسی بھی کوئی بات نہ تھی جو انھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کے صحابہ پر جھوٹ باندھنے اور وضع حدیث پر آمادہ کرے پس ترتیب نزول کے باب میں ہمارا علم اسی طرح قطعی ہے جس طرح سارے مشاہدات قطعی ہیں۔[1]

[1] نزولی ترتیب پر اجماع اور مشاہدات کی سی قطعیت کا دعویٰ علامہ موسیٰ جار اللہ جیسے وسیع النظر عالم کی طرف سے ہمارے لیے حیرت انگیز ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۸۱ پر)

پس جو شخص ترتیب سور کی تحقیق کی وجہ سے مجھ پر مستشرقین کی تقلید کا الزام لگاتا ہے وہ اس تہمت سے میرے اس اخلاص کو باطل ٹھہراتا ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں میرے پیش نظر ہے اور اللہ کی کتاب مجھے اس تہمت سے بری قرار دیتی ہے اور میں انشاء اللہ اللہ کے نزدیک سرخرو بندہ ہوں اور یہ سب کچھ میری کتاب ترتیب سور کی برکت سے حاصل ہوگا۔[۵]

میں نے ترتیب سور کی فصل میں بیان کیا ہے کہ جو ترتیب تلاوت، کتابت، طباعت اور استدلال میں معتبر ہے وہ مصاحف والی ترتیب ہے نہ کہ نزول والی پس جہاں تک ان تینوں امور کا تعلق ہے نزولی ترتیب کو شارع حکیم نے اپنی زندگی ہی میں منسوخ کر دیا، باقی رہا علم ترتیب تو وہ نزول کی طرح باقی ہے (؟!) اور یہ علوم قرآن میں سب سے پہلی چیز ہے، بالکل ابتدائی جس کا نصاب تعلیم میں اہتمام ہونا چاہیے نہایت سہل چیز ہے اور اس میں فائدہ بہت ہے۔ کسی عالم کو بھی اس سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے۔

جو شخص ہماری کتاب کو اٹھائے گا اور اس کو علم اور محنت کے احترام کی نگاہ سے دیکھے گا وہ پائے گا کہ اس کے مؤلف نے ان لوگوں کے اوہام کی جڑ کاٹ دی ہے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے عہد اور آپ کے صحابہ کے حالات کے مقتضی کو بنیاد قرار دے کر سورتوں کی ایک نئی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس ترتیب جدید کے باب میں ان کی کوئی بات بن ہی نہیں سکتی جب تک وہ نبی کریم صلعم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰) قرآن کا نزول اللہ کے علم سے ہوا اور ترتیب نزول اللہ کے ارادہ سے ہوئی صحابہ نے اس نزول کا مشاہدہ کیا یہ ساری باتیں صحیح ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے ہم علامہ کا یہ دعویٰ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ تابعین سے حفاظ میں کوئی وہم اور خلل نہ تھا اور وہ اللہ اور رسول یا صحابہ کی طرف غلط بات نہیں منسوب کر سکتے تھے لیکن جب نزولی ترتیب کا سرے سے دین میں کوئی اعتبار ہی نہیں تھا، نہ تلاوت میں، نہ کتابت میں، نہ استدلال میں تو آخر وہ اس کو محفوظ رکھنے کی سعی کیوں کرتے، وہ بالفرض محض تبرک تاریخی کے طور پر اس کو محفوظ رکھنا بھی چاہتے تو یہ یاد رکھو کب تک؟ قرآن کے نزول کا حال یہ تھا کہ وہ ضرورت یا حالات کے تقاضے سے تھوڑا تھوڑا کر کے اترا تھا اور ایک ہی وقت میں کئی کئی سورتیں بعض اوقات نازل ہوتی تھیں۔ کچھ آیتیں ایک سورہ کی اترتیں، کچھ دوسری کی، کچھ تیسری کی وعلیٰ ہٰذا۔ ایسی صورت میں صحابہ کس طرح اس بات کو محفوظ رکھ سکتے تھے کہ کون آیت کب اتری، اور کون سورہ کب تمام کو پہنچی اور ان میں باہم دگر کس قدر تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا ریکارڈ رکھنے کے لیے ایک پورے نظام کی ضرورت تھی اور یہ در دسر اس صورت میں برداشت کیا جا سکتا تھا جب نزولی ترتیب کے ساتھ کوئی مصلحت دینی وابستہ ہوتی لیکن صحابہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نزول قرآن بلحاظ ضرورت ہوا ہے اور سورتوں میں آیات کی ترتیب اور پھر سورتوں کے ساتھ سورتوں کی ترتیب ایک حکمت الٰہی پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس کو انھوں نے محفوظ بھی رکھا اور تواتر نے اس پر دوام کی مہر بھی ثبت کر دی کیونکہ اس ترتیب پر حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلعم کو قرآن سنایا، اسی ترتیب پر آنحضرت صلعم نے صحابہ کو سنایا اور پھر اسی ترتیب پر امصار و بلاد میں قرآن کے نسخے بھیجے بھی گئے اور یہی ترتیب تابعین کو ورثہ میں بھی ملی۔ رہی نزولی ترتیب تو اس کا علم تمام تر استنباط و استقراء پر مبنی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں تحت اختلاف ہے۔ اس باب میں قابل وثوق روایات بہت تھوڑی ہیں۔ اس میں صرف ایک اسی قدر تدریجی ارتقاء کے اعتبار سے موٹی موٹی قسمیں کی جا سکتی ہیں مثلاً بالکل ابتدائی سورتیں، قبل ہجرت کی سورتیں، بعد ہجرت کی سورتیں باقی ان تمام جزئی تفصیلات کی ترتیب جس کے مدعی علامہ موصوف بن جاتے ہیں، ناممکن ہے اور اس پر اجماع کا دعویٰ کرنا اور اس کو مشاہدہ کی سی قطعیت کا درجہ دینا غلو فی الدین ہے جس سے ہر مسلمان کو محفوظ رہنا چاہیے۔ علامہ کو یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ایک فرد کو اس کی زندگی میں جن ضروریات و حالات سے سابقہ پیش آتا ہے ان میں بھی کوئی ترتیب بجز اس کے جو علم الٰہی نے بتقاضائے تعلیم پیدا کی ہو قائم نہیں کی جا سکتی اور یہاں تو ایک پوری امت کی ضروریات و حالات میں ترتیب کا سوال ہے جس کے سمجھنے کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جس کا علم پورے نظام کائنات کی تقدیر پر حاوی ہو اور بشر کو یہ چیز حاصل نہیں۔

[۵] بے شک ہم نے یہ ضرور لکھا ہے کہ مستشرقین کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی نزولی ترتیب کی سراغ رسانی کا ذوق بڑھ رہا ہے لیکن علامہ کو اس بات سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی وبا کے زمانہ میں اگر کوئی شخص مرتا ہے تو خواہ وہ کسی بیماری سے مرے سان یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ اسی کے اثر سے مرا ہے جس ترتیب کو علامہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ شارع نے منسوخ کر دیا اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا دین میں کوئی اعتبار نہیں پھر اس پر اس شد و مد سے سوچنے کا نام کر کے اس کے سوا کیا معنی رکھتا ہے کہ یہ بھی اسی وبا کا اثر ہے جس میں اس وقت مستشرقین اور ان کے مقلدین مبتلا ہیں اور ان کی اور ان کے کاموں کی مثالوں سے علامہ بے خبر نہیں ہوں گے۔

کی عقل اور آپ کے قلب معصوم کو اپنی عقل اور اپنے قلب پر قیاس نہ کریں۔ ان کے قیاس میں برہان اور حد اوسط کی حیثیت ان کی ذات کو حاصل ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہم آپ کے عہد میں ہوتے تو وہی کرتے جو آپ نے کیا اور وہی کہتے جو آپ نے کہا۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ غائب کو حاضر پر قیاس کریں[1]۔

میں نے کتاب کا نام ترتیب السور رکھا ہے اور مقصود اس کتاب سے سورتوں کی نزولی ترتیب اور پھر اس ترتیب کے تناسب کو واضح کرنا ہے جو مصاحف میں ہے۔ میں نے سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب کے بیان کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پھر میں سورتوں کے اندر آیات کے تناسب و نظم کو بھی واضح نہ کر سکا اگرچہ میں نے "فقہ القرآن الکریم" میں نظم کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔ اور خاتمۂ کتاب میں (صفحہ ۲۴۲) میں نے اپنا وہ خیال ظاہر کیا ہے جو میں درباب نظم آیات ان لوگوں کے خلاف رکھتا ہوں جو نظم کو ناممکن سمجھتے ہیں یا اس کو واجب مانتے ہیں۔

میں نے سورتوں کی ترتیب اپنی کتاب میں تین مختلف مدارج میں واضح کی ہے۔ (۱) قصیدہ میں (۲) جدولین میں (۳) فصلوں میں اور کوئی ایسی ترتیب اپنے جی سے گھڑ کے نہیں گھڑی کی ہے جو مسلمانوں کے کسی سلسلہ میں نہ ہو۔ اور مسلمانوں کے جو سلسلے ہیں ان میں نہایت معمولی اختلافات ہیں پس میں نے اسی کو اجماعی[2] ترتیب نزول قرار دیا۔ اور جامع ازہر نے مصحف امیری کی طباعت میں جو ترتیب ملحوظ رکھی ہے میں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ اس نے آیات شمار کر کے بھی نہایت خوب کیا۔ یہ شمار کرنا سنت ماثورہ ہے اور جس نے کسی سنت کو زندہ کیا گویا اس نے ساری سنتوں کو زندہ کیا۔

تناسب کے بیان میں، میں نے قرآن کریم پر اعتماد کیا ہے اور ہر سورہ کے لیے ایک فصل قرار دی ہے اس طرح قرآن کریم میں جتنی سورتیں ہیں بیان نظم کے لیے فصلیں بھی اتنی ہی ہیں یہ بحث صفحہ ۱۸ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۰۸ پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی یہ پوری بحث ۹۰ صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

ہم تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور پھر ایک حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکیم و علیم کے پاس سے اس کو پایا اور یہ کتاب ام الکتاب میں ہے جو نہایت برتر اور پُر حکمت ہے۔ اس کی آیات، حروف اور سارے کلمات کی ترتیب ایک مدبر و خبیر کی دی ہوئی ترتیب ہے۔ اس کتاب میں کوئی ایسا حرف نہیں ہے جو دو حرفوں کے درمیان مقدم یا موخر ہو کر آیا ہو مگر یہ کہ اس کی تقدیم و تاخیر ایک خاص مقصد، ایک کامل علم اور ایک حکیم و علیم کی نہایت اعلیٰ حکمت کے تحت ہے۔ اس حکمت تک عقل کی رسائی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اس پر غور و فکر کرتی ہے اور پھر اس سے یا دہانی حاصل کرتی ہے۔ مختلف آیات، اگرچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسباب و واقعات اور حوادث و ضروریات کے لحاظ سے نازل ہوئیں، لیکن جس حکیم و خبیر نے ان کو محکم کیا اور ان کی تفصیل فرمائی اس نے ایک ترتیب کے ساتھ ان کو ان کی جگہوں میں رکھا اور ان کی جڑیں جمائیں۔ جس خدا کی شان یہ ہے کہ اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی اس نے اپنی کتاب کو یونہی بغیر کسی ترتیب اور گٹھاؤ کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے اپنے علم سے اس کی ترتیب دی اور نبی کریم نے وحی الٰہی کے مطابق، علم و اہتمام کے ساتھ اور افادہ و ہدایت کو پیش نظر رکھ کر، اس کی شیرازہ بندی فرمائی۔ یہاں تک کہ ہر سورہ کی آیات اور پورے قرآن کی سورتوں میں ایک ایسا ربط و نظم پیدا ہو گیا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو مطلوب تھا اور عقل، اگر

---

[1] ہم علامہ کی اس کاوش کے پورے احترام کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے اپنی اس کتاب سے جن لوگوں کے اوہام کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی ہے ان کے اوہام کو اس سے غذا ملے گی اور وہ نئی نئی ترتیبیں پیدا کریں گے اور ان کے نکات و لطائف بھی کچھ کم نہ ہوں گے اور عجب نہیں کہ وہ اپنی ترتیب کو بھی اجماع اور مشاہدہ کی سی قطعیت کا دعویٰ کریں۔

[2] کسی ترتیب نزولی کو اجماعی ترتیب قرار دینا لفظ اجماع کی حقیقت سے لوگوں کو بدگمان کرنا ہے۔

تدبر و تذکر کرے، اس مقصود تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ کتاب انزلناہ الیک مبارک .... لیدبروا ایاتہ ولیتذکر اولوا الالباب۔ (ص)

یہ عقیدہ امت کے دلوں میں بلا وجہ نہیں ڈالا گیا اور نہ یہ ممکن ہے کہ جو ربط و نظم اللہ تعالیٰ نے مرعی رکھا ہے وہ ایک معمہ بنا رہے جو کبھی حل ہی نہ ہو۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ بچوں کا ایک کھلونا ہو جو حاصل ہو بھی تو لاحاصل ہی رہے۔ ان ھو الا ذکر للعالمین ولتعلمن نباہ بعد حین۔

چنانچہ میں نے اللہ پر بھروسہ کر کے عزم کیا اور بسم اللہ کر کے تناسب سور کی فصلیں لکھیں اور یہ بحث ہماری کتاب کے نصف حصہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ میں نے یہ کتاب اخلاص کے ساتھ محض اس کی خوشنودی کے لیے لکھی ہے۔ میں نے اپنے امکان بھر بیان نظم کی کوشش کی، دو، کسی بات کا دعویٰ نہیں کیا اور اس فطری منطق کو نہیں بھولا جو ایک بدوی کے شعر سے سیکھی تھی۔

فلا کل من یسعی یصید غزالۃ

ولکن من صاد الغزالۃ قد سعی

پس میں نے بیان تناسب کی فصلوں میں، اس اللہ کی مدد سے جو اپنی راہ میں جد و جہد کرنے والوں پر راہیں کھولتا ہے، ہر طرح کے شکار جمع کر دیے ہیں، ہرن بھی اور شیر بھی۔ پس اگر کوئی سچے سے سچا آدمی بھی یہ کہے کہ تمہاری کوشش لاحاصل ہے تو ہر وہ شخص جو اپنے مشاہدات کو نہیں جھٹلا سکتا اس کی بات کی تردید کر دے گا۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ میری جد و جہد لاحاصل ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کے سامنے تناسب (نظم) کے بعض پہلو بیان کر دوں جو میں نے کتاب میں ظاہر کیے ہیں اور بقیہ وجوہ جو میں ان اوراق میں بیان نہیں کر سکتا نہایت اعلیٰ اور ٹھوس اور مناسب ہیں[2]

۱۔ سورہ علق (۱۸ : ۳۱)

یہ پہلی سورہ ہے جو نازل ہوئی اور جس نے نبی کے لیے رب العزت کے ساحت جلال کے دروازے کھولے اور دنیا کے لیے اس کی رحمت کے۔ یہ ایک مستقل سورہ ہے جس کو ہر سورہ کے پہلے اور ہر سورہ کے بعد رکھا جانا ممکن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سورہ قدر کے ساتھ رکھا جو باعتبار نزول پچیسویں سورہ ہے۔ مجرد اس رکھنے ہی سے انا انزلناہ فی لیلۃ القدر میں ضمیر مفعول کا مرجع آپ سے آپ واضح ہو گیا۔ نیز آغاز وحی اور رسالت عالم کے ابتداء کی تاریخ بھی واضح ہو گئی کہ وہ ایک اہم ترین اور مقدس ترین دن ہے۔

---

[1] اس پورے پیراگراف کے لیے اللہ تعالیٰ علامہ کو جزائے خیر دے۔ بے شبہ قرآن کے نظم و ترتیب کے حسن و جمال کا حال یہی ہے۔ لیکن اس کو تمام مسلمانوں کے عقیدہ کی حیثیت سے پیش کرنے میں علامہ نے حسن ظن سے کام لیا ہے۔ علماء کا گروہ عظیم تو مدتوں سے اس وہم میں مبتلا ہے کہ نہ تو ایک سورہ کی آیتوں میں کوئی نظم ہے اور نہ باہم دگر سورتوں میں کوئی تناسب ہے بلکہ بہتوں نے تو اس بے نظمی و بے ترتیبی ہی کو قرآن کا اصلی جمال بلکہ اس کا اعجاز قرار دے دیا ہے۔ خیر القرون کے بعد بہت تھوڑے ہوئے ہیں جو نظم قرآن کے صحیح معنوں میں قائل ہوئے اور اس کے لیے سب سے زیادہ صحیح نہج پر کوشش مولانا حمید الدین فراہیؒ نے کی۔ کثر اللہ امثالہ۔

[2] علامہ نے یہاں ہم پر بالکل غلط الزام لگایا ہے۔ مصاحف میں سورتوں کی جو ترتیب ہے وہ ایک عظیم حکمت پر مبنی ہے اور اس کے اسرار پر جو لوگ غور کرتے ہیں ان کی کوشش ایک مبارک کوشش ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو علامہ پر یہ اعتراض نہیں ہے کہ انھوں نے غلط طرف پا نچے ترجمانی کیے ہیں۔ بلکہ ہم نے صرف یہ کہا ہے کہ علامہ کی کوشش اس باب میں کوئی خاص قیمت نہیں رکھتی۔ مختصر ریویو میں اس اجمال کی تفصیل کا موقع نہیں تھا اور اب بھی ہم اس قصہ کو طول نہیں دینا چاہتے لیکن چونکہ علامہ نے اپنے بعض نادر انکشافات کا یہاں ہم پر حجت قائم کرنے کے لیے ذکر فرما دیا ہے اس لیے ہم انہی کی منتخب کی ہوئی مثالوں کو واضح کیے دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ علامہ نے کس طرح کے اسرار واضح کیے ہیں اور جو نکتہ یہ خود علامہ کے منتخب کیے ہوئے ہوں گے اس وجہ سے لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ جس دولہ کے منتخب موتی یہ ہیں اس کے بقیہ ذخیرہ کا کیا حال ہو گا۔

اور آخری آیت جو آنحضرت صلعم پر بروز پنجشنبہ ۸ ربیع الاول ۱۱ھ کو نازل ہوئی وہ یہ ہے: واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (۲-۲۸۱) اس کی بابت آنحضرت صلعم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کو سورہ بقرہ میں آیت ۲۸۱ کی جگہ رکھیں۔ آنحضرت صلعم کا ایک خاص عدد پر زور دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا اور ایک ایسی بات جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اہتمام فرمایا ہو ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم اس کو ناقابل توجہ قرار دے دیں۔ اور یہ بھی کچھ اچھی بات نہ ہوگی کہ ہم اس کو کسی ایسے معنی پر محمول کریں جس سے ایک حکیم کے لیے سکوت یا اعراض اولیٰ ہو۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے ایک خاص عدد پر آنحضرت صلعم کے زور دینے کی علت مجھ پر واضح کر دی۔ چنانچہ میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر یہ بات لکھی ہے کہ "خاتمہ نزول نے اپنے آپ مدت نزول بیان کر دی جس طرح سورہ علق کے بعد سورہ قدر (۲۰-۲۱) کے رکھے جانے سے آغاز وحی اور رسالت کی تاریخ بیان ہو گئی۔ اب اگر ان دونوں بیانوں کو یکجا کر دو تو اس سے خود بخود پوری مدت نزول قرآن معلوم ہو جائے گی۔ یعنی لیلۃ القدر رمضان ۱۳ قبل ہجرت سے لے کر ۸ ربیع الاول ۱۱ھ کی صبح تک ۲۳ سال پانچ ماہ کی مدت میں قرآن نازل ہوا۔"[1]

---

[1] سورہ اقرا (علق) پر چونکہ لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ اولین وحی ہے اور اس میں قرآن کے نزول اور انسانوں کو نوشتہ آسمانی دیے جانے کی خبر ہے۔ اور اس کے بعد ہی سورہ قدر کو انا انزلناہ (ہم نے اس کو اتارا) سے شروع فرمایا اور ضمیر کا مرجع واضح نہیں فرمایا جس سے ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ اس کا مرجع وہی کتاب اور وحی ہے جس کا سابق سورہ میں ذکر ہے اور پھر اس بات سے کہ اس کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا یہ چیز بھی سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن کا نزول رمضان میں لیلۃ القدر میں ہوا۔ یہ بات صحیح ہے۔ چنانچہ محققین کا ذہن اس طرف گیا ہے اور یہ بات علامہ نے بھی لکھی ہے اور ہم اس کی تائید کرتے ہیں لیکن اس کے بعد علامہ نے نزول قرآن کے خاتمہ کی تاریخ بیان فرمائی ہے جو صرف ان کی تنہا تحقیق ہے اور نہایت عجیب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے آخر میں بقرہ کی آیت واتقوا یوما ترجعون (الآیۃ) نازل ہوئی اور آنحضرت صلعم نے خاص طور پر عدد کی تعیین کے ساتھ فرمایا کہ اس کو بقرہ میں ۲۸۱ کی جگہ رکھو۔ یہ عدد خاص پر آنحضرت کا زور دینا بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں ضرور کوئی نکتہ بعید ہے۔ اس کے بعد علامہ اس بعید کو کھولتے ہیں کہ ۲۸۱ کے عدد پر زور دینے سے مقصود آنحضرت صلعم کا قرآن کی مدت نزول کو بتانا تھا کہ یہ ۲۸۱ مہینے ہے۔ ۲۸۱ مہینوں کے ۲۳ سال پانچ ماہ ہوں گے اور روایات سے ثابت ہے کہ یہی مدت نزول قرآن ہے۔ سورہ قدر نے ابتدائے نزول قرآن کی تاریخ واضح کر دی اور بقرہ کی اس آیت نے خاتمہ نزول کی۔ علامہ اپنے اس انکشاف کے بدر میں دولت کونین بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لیکن مختلف وجوہ سے ہمارے دل میں اس نکتہ کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ اولاً تو یہ کہ قرآن اس طرح کے تاریخی نکات و لطائف سے بہت ارفع مقصد کے لیے نازل ہوا ہے۔ ثانیاً یہ بات ثابت نہیں ہے کہ فی الحقیقت نزول کے اعتبار سے یہ آخری آیت ہے۔ بقرہ میں یہ آیت تحریم ربوا کے حکم کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے یہ حکم دینے کے بعد کہ اپنے اصل راس المال سے ایک پیسہ بھی زیادہ لینا اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ ہے اور وصولی قرضہ میں تنگ حال کو مہلت دو اور اگر کل معاف کر دو تو بہتر ہے یہ فرمایا کہ اس دن سے ڈرو جس دن خدا کے پاس جانا ہے اور ہر جان اپنے کیے کا بدلہ پورا پورا پائے گی "پھر اسی سلسلہ کی بات کتابت دین اور رہن کا بیان آ جاتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہ اتنا ٹکڑا اپنے سلسلے سے بالکل الگ آخر میں نازل ہوا ہو جبکہ معلوم ہے کہ سود، کتابت اور رہن کے یہ احکام آخری احکام نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن کا سیاق کسی راوی کے بیان سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ ثالثاً یہ کہ علامہ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آنحضرت نے ۲۸۱ کے عدد پر زور دیا۔ ممکن ہے حضور نے فرمایا ہو کہ اس آیت کو بقرہ کی فلاں آیات کے بعد رکھو۔ (روایات سے ثابت ہے کہ حضور یوں ہی فرمایا کرتے تھے نہ کہ عدد کی تعیین کے ساتھ) اور راوی نے اس بنیاد پر کہ آیت کا نمبر ۲۸۱ تھا حضور کی بات کو عدد کی تعیین کے ساتھ نقل کیا ہو۔ اور روایت بالمعنی کے اعتبار سے یہ بات خلاف حقیقت بھی نہیں ہے۔ پس اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے محض ایک واہمہ پر ایک ہوائی قلعہ تعمیر کر دینا کوئی اچھی بات نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس میں باطنیت کی بو آتی ہے جس سے ہم علامہ حافظ اللہ جیسے محقق کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔

اگر میری یہ کوشش تمہاری نظر میں سعی لاحاصل ہے تو میری نظر میں یہ کوشش اتنی وقیع ہے کہ میں اس کا کوئی بدل بھی قبول نہیں کر سکتا اگر چہ مجھے زمین کے برابر سونا دیا جائے اور اسی کے مثل اس کے ساتھ اور بھی۔

۲۔ سورہ قصص، اسراء، اور یونس یکے بعد دیگرے نازل ہوئیں۔ ان کے درمیان کوئی اور سورہ نازل نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلعم نے سورہ یونس کو توبہ کے بعد رکھا۔ میں نے اللہ کی مدد اور توفیق و ہدایت سے ان سورتوں کی نزولی ترتیب کی حکمت بھی بیان کی اور ان کی جو ترتیب مصاحف میں ہے اس کے وجوہ بھی واضح کیے اور مجھے امید ہے کہ ہر شریف اور منصف آدمی جو ان تینوں فصلوں پر غور کرے گا ان کو پسند کرے گا یا ان سے بہتر وجوہ حکمت سے ان کی تائید کرے گا۔[۱]

ہر سورہ سے متعلق جو فصلیں لکھی ہیں ان میں نئے نئے فوائد اور آیات قرآن کے معانی سے متعلق نہایت درست اور پرحکمت باتیں ہیں جن کو میں نے اس خیال سے کھل کر بیان کیا ہے کہ کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کے شوق کی قدر افزائی ہو اور وہ کتاب کے پڑھنے میں جو زحمت اٹھائیں اس کا صلہ پائیں۔

قول خداوندی فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا باسنا (پس ان کے ایمان نے کچھ نفع نہیں دیا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا) کو قوم یونس کے مستثنیٰ رکھے جانے کے باب میں میں نے ایسی نادر حکمت بیان کی ہے جو اس کتاب کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہ مل سکے گی (ص ۹)[۲]

۳۔ سورہ رحمان باعتبار نزول رعد کے بعد ہے اور مصاحف میں سورہ قمر کے بعد رکھی گئی ہے۔ میں نے اللہ کی مدد سے اس کی نزولی ترتیب کی حکمت بھی کھول دی ہے اور مصحف کی ترتیب کا راز بھی بیان کر دیا۔[۳] (ص ۱۴)

[۱] علامہ کے نزدیک سورہ قصص کے بعد سورہ اسراء کے نزول کا راز یہ ہے کہ سورہ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کا پورے دس سال مدین میں ٹھہر کر آیات الٰہی کا سیکھنا بیان ہوا ہے اور سورہ اسراء یہ واضح کرتی ہے کہ آنحضرت صلعم کو ایک ہی شب میں تمام اسرار ملکوت کی سیر کرا کے سمیع و بصیر بنا دیا گیا۔

سورہ توبہ کے بعد سورہ یونس کے رکھے جانے کا رمز علامہ کے نزدیک یہ ہے کہ سورہ یونس میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت یونس کی (علیہم السلام) ہدایت خلق کے بارہ میں تنگ نظری بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون نے فرعون کی تباہی کی دعا کی، اسی کے مشابہ حضرت یونس کا حال ہوا۔ برعکس اس کے آنحضرت صلعم اپنے سینہ میں ساری خدائی کا درد رکھتے تھے اور اپنی قوم کے لیے بددعا نہیں کی۔ گو سورہ یونس کو سورہ توبہ کے ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح تبوک میں تین پیچھے رہنے والوں کی توبہ قبول ہوئی اسی طرح ان تینوں نبیوں کی توبہ بھی قبول ہوئی۔

یہ نکتے میلاد خواں واعظوں کی گرمی محفل کے لیے تو موزوں ہیں مگر اہل علم کو ان پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

[۲] علامہ کی اس نادر حکمت کو اہل علم سے درخواست ہے کہ اصل کتاب میں خود ملاحظہ فرما لیں، ہم تو اس کو نقل کرنے کی ذمہ داری بھی نہیں اٹھا سکتے البتہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا کی اس طرح کی غلطیوں کو معاف کرے۔

[۳] یہ نکتہ علامہ کا شاہکار ہے۔ سورہ رحمٰن میں پہلا سوال علامہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں پہلے قرآن کے سکھائے جانے کا ذکر ہے اور اس کے بعد انسان کی پیدائش کا۔ تو انسان کی پیدائش سے پہلے آخر کس کو خدائے رحمٰن نے قرآن سکھایا؟ علامہ اس سوال پر مدتوں غور کرتے رہے بالآخر اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ ان پر یہ راز کھولا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے خود قرآن مجید کو سکھایا کہ وہ کس طرح دلوں کو تسخیر کرے اور عالم میں انقلاب برپا کرے۔ بالآخر قرآن نے اللہ تعالیٰ سے تسخیر قلوب کا فن سیکھ کر دلوں کی صفیں الٹ دیں اور کائنات میں ہلچل برپا کر دی

(باقی حاشیہ صفحہ ۸۶ پر)

اگر کوئی شخص ان حکمتوں کا منکر ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے انکار کی وجہ پیش کرے اور جو حکمت میں نے بیان کی ہے اس سے بہتر کوئی بات ہمارے سامنے رکھے اور محض بات بنانے کے لیے نہ تو نظم قرآن پر کوئی اضافہ کرے بلکہ الرحمٰن علمہ القرآن کے نظم کی لفظی پیروی کرے اور نہ یہ کہنے کی جسارت کرے کہ اس میں مفعول اول محذوف ہے اور قرآن مفعول ثانی ہے کیونکہ نظم قرآن کی اصلاح و ترمیم کی جسارت کسی مسلم کی شان نہیں ہے۔

میں ان تین مثالوں پر کفایت کرتا ہوں۔ ساری فصلوں کی شان تحقیق یہی ہے۔ ہر ایک میں قرآن کریم کے علوم، آیات کے معانی اور مصاحف کی تاریخ سے متعلق نہایت زریں حقائق و اصول بیان ہوئے ہیں۔

میں تمام اہل علم سے درخواست کرتا ہوں کہ براہ کرم وہ مجھے بتائیں کہ اس طرح کی کتاب سے کیا خطرے متصور ہیں اور خود قرآن کریم کی روشنی میں وجوہ ترتیب اور وجوہ تناسب بیان کرنے سے کن فتنوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا احتمال ہے۔ وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵) سورہ رعد کے بعد سورہ رحمٰن کے نزول کا راز یہ ہے کہ سورہ رحمٰن رعد کی آیت ولو ان قرآنا الایۃ کی تفصیل ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن سے تہی نہ دامن تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ اس سے پہاڑ چلنے لگیں گے، زمین شق ہو جائے گی، مردے بولنے لگیں گے۔

سورہ قمر کے بعد اس کے رکھے جانے کی وجہ علامہ کے نزدیک یہ ہے کہ چاند کا پھٹنا قرآن کی تاثیر سے ہوا اور قرآن کا یہ معجزہ پہاڑوں کو چلا دینے اور مردوں کو زندہ کر دینے سے زیادہ شاندار ہے۔

ان نکات پر ہم کوئی تبصرہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، اہل علم خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ ذوق سلیم کہاں کہ ہم ان پر جھوم جائیں۔ جی چاہتا ہے اس خوان معانی و حکمت کے کچھ موتی ہم اپنے انتخاب سے بھی پیش کریں لیکن اس قصہ کو طول دینے سے کچھ فائدہ نظر نہیں آتا۔

رسائل و مسائل

مسلمانوں کو اسلام سے بچانے کی فکر

سوال:- اگر آپ اپنی اسلامی تحریک کو کفار و مشرکین سے شروع کرتے اور "نسلی مسلمانوں" کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تو کیا یہ اچھا نہ ہوتا؟ (اس کے علاوہ اس مراسلہ میں "نسلی مسلمان" کی اصطلاح پر بھی سخت آزردگی کا اظہار کیا گیا ہے)

جواب:- آپ کے اس فقرے کو پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ مجھے معاف فرمائیں اگر میں صاف کہوں کہ اس فقرے میں مجھے یہودیانہ ذہنیت کی بو آتی ہے۔ برائے خدا سوچیے کہ اگر یہ دعوت حق ہے تو نسلی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار و مشرکین کی طرف رجوع کرنے کا آپ کیوں مشورہ دے رہے ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حق آپ لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہے اور آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اسے آپ کے دروازے ہی سے دور رکھا جائے؟ لیکن اگر یہ دعوت باطل ہے، تو خواہ نسلی مسلمان ہوں یا کفار و مشرکین، آپ کو اصرار کرنا چاہیے کہ دونوں گروہ اس سے محفوظ رہیں۔ "نسلی مسلمانوں" کا لفظ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں بری طرح چبھا ہے اور اسی لیے آپ اسے طعن آمیز طریقہ سے بار بار دہراتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کے پاس ان تمام نسلی مسلمانوں کو اصلی مسلمان ثابت کرنے کے لیے کچھ دلائل ہیں تو ارشاد فرمایئے تاکہ میں پھر ان الفاظ سے توبہ کر لوں؟

کائناتی اور حیاتی ارتقاء

سوال:- آپ نے رسالہ ترجمان القرآن جلد ۳ عدد ۴ صفحہ ۲۹۶ تا صفحہ ۳۰۹ میں اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے زیر عنوان نظام عالم کے انجام کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ "اس نظام کے تغیرات و تحولات کا رخ ارتقاء کی جانب ہے۔ ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں" وغیرہ۔ آخر یہ کس قسم کا ارتقاء ہے؟ حیوانی زندگی میں؟ جماداتی یا انسانی زندگی میں؟ یا مجموعاً تمام نظام عالم کی زندگی میں یہ ارتقا کارفرما ہے؟ نیز اگر ہر بگاڑ سے ارتقائی اصلاح ظاہر ہوتی ہے تو پھر تو وہی بات ہوئی جو ہیگل نے (Theis & anti-Theis) اور ڈارون نے (Survival of the fittest) میں پیش کی ہے۔ براہ کرم مدعا کی وضاحت کیجیے۔

جواب:- جس ارتقاء کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ہیگل اور ڈارون دونوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ ہیگل تو تصورات اور خیالات کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسی نزاع کی بدولت تصورات کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اور ڈارون حیات کے ارتقا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے نزدیک ارتقاء تنازع للبقاء (Struggle for existance) انتخاب طبیعی (Natural selection) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے اصول سہ گانہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند تر درجہ کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے۔ اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات، اور حیوانات میں بھی کمتر درجہ کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے، یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بحیثیت مجموعی بھی

جاری ہونا چاہیے، یعنی موجودہ نظامِ عالم بحیثیت مجموعی ناقص ہے لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم ہونا چاہیے جو اس سے کامل تر ہو اور اسی نظام کا نام عالمِ آخرت ہے گویا میرے نزدیک موجودہ نظامِ عالم کے بعد عالمِ آخرت کا آنا قدرت کے قانونِ ارتقا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

جماعت اسلامی کے تعلیمی پروگرام پر ایک اعتراض

سوال: تعلیمی کانفرنس کی مجوزہ اسکیم (شائع شدہ ترجمان القرآن دکوثر) بہت اہم اور ضروری ہے لیکن مجھے اس کے متعلق کچھ شبہات ہیں۔

میں صاف کہوں گا کہ اگر میرا بس چلے تو بقول برنارڈ شا میں تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔۔۔ آپ خود سوچیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی یونیورسٹی یا کالج بنایا تھا؟ مگر پھر بھی عظیم الشان ہمہ گیر انقلاب برپا کر دکھایا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں کی اس گرتی کام کی رفتار بہت سست ہو جائے گی اور جماعت اسلامی کا ادارہ ایک انقلابی اصلاحی ادارہ کے بجائے زیادہ سے زیادہ ایک تجارتی ادارہ بنکے رہ جائے گا۔ کیا دیوبند اور جامعہ ملیہ اور اسی طرز کی دوسری درسگاہیں انقلابی تحریکات کا مرکز بن سکی ہیں؟ وہاں یقیناً درس و تدریس بھی ہے اور قال اللہ اور قال الرسول کا غلغلہ بھی۔ لیکن کیا صحیح معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مشن کے لیے کوئی کام ہو رہا ہے؟ اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

جواب: آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تعلیم گاہ قائم نہیں کی تھی۔ اگر اس کا نام یونیورسٹی یا کالج نہیں تھا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں کوئی درسگاہ یا تربیت گاہ نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ جانے کے بعد سے تعلیم اور اخلاقی تربیت دونوں چیزوں پر مسلسل توجہ فرمائی۔ خصوصیت کے ساتھ اصحابِ صفہ تو براہِ راست آپکے زیرِ تعلیم و تربیت تھے۔ پھر آپ نے انہی تربیت یافتہ لوگوں سے بڑے پیمانے پر تعلیم تبلیغ اور جہاد کا کام لیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو تحریک تعمیری اور اصلاحی انقلاب چاہتی ہے اور جس کے پیشِ نظر صرف توڑ پھوڑ کی قسم کا انقلاب نہیں ہوتا وہ کبھی تعلیم کے انتظام سے غافل نہیں ہو سکتی۔

آپ کو جو اندیشے ہیں وہ دراصل بے مقصد تعلیم گاہوں کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے محض ایک درسگاہ کا چلانا ہی بجائے خود مقصود ہوتا ہے یا جن کا مقصود کسی خاص کورس کو پڑھا دینے سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن ایک بامقصد تعلیم گاہ جس کے پیشِ نظر واضح طور پر ایک خاص نصب العین کے لیے آدمیوں کو تیار کرنا ہو وہ تو حقیقت میں ہر اصلاحی و انقلابی تحریک کی جان ہے اور اسی پر تحریک کا پائدار بنیادوں پر چلنا منحصر ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں سیکڑوں آدمی اپنی جگہ لینے والے تیار نہ کریں تو یہ تحریک محض دو چار آدمیوں کی شخصیتوں سے وابستہ رہے گی اور ان کے مرتے ہی تحریک بھی مر جائے گی۔

برنارڈ شا ایک مسخرہ آدمی ہے جس نے کبھی تمام عمر کسی تعمیری یا اصلاحی تحریک کے لیے کوئی انقلابی کام نہیں کیا ہے۔ اس کے چٹخارے دار فقروں کی پیروی کر کے آپ کہیں نہیں پہنچ سکتے۔

افضل المومنین

سوال: کیا بحیثیت خلیفہ اول و بحیثیت کبر سنی و دیگر محاسن کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دوسرے خلفاء یعنی حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر فضیلت و برتری حاصل ہے؟ یہ مسئلہ ایک مدت سے زیرِ بحث ہے۔ اسے حل فرما کر ممنون کیجیے۔

جواب: جو شخص بھی اسلام کو جانتا ہو اور جس نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہو اسے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہو گا کہ پوری تاریخِ اسلام میں ایک شخص بھی اس پایہ کا نہیں گزرا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے بعد اس دین کی روح کو اس قدر مکمل طور پر اپنے اندر جذب کر چکا ہو

جیسا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس معاملہ میں دو رائیں ممکن نہیں ہیں اور اس سے اختلاف صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو اسلام کو نہیں سمجھتا یا پھر کسی تعصب میں مبتلا ہے۔ لیکن یہ رائے رکھنے کے باوجود میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو صحابہ یا دوسرے اشخاص کے درجے متعین کرنے اور ان میں سے کسی کے افضل اور کسی کے مفضول ہونے کا فیصلہ کرنے کا ذمہ دار قرار دے لیں اور ان بحثوں میں اپنا وقت فضول ضائع کریں۔ ان معاملات کا فیصلہ تو خدا خود کر دے گا۔ ہمیں جس چیز کی فکر کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو خدا کے ہاں کس درجے کا مستحق بنا رہے ہیں۔

والدین کی مشتبہ جائداد اور کمائی سے استفادہ

سوال:۔ مدت سے جماعت اسلامی میں شامل ہو جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں مگر رزق حرام سے اپنے آپ کو بچانے اور حلال و طیب طریقوں سے ضروریات زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں۔

ہمارا آبائی ذریعہ معاش زمینداری ہے اور مجھے معلوم ہے کہ مدتوں سے ہماری زمینیں نہ تو ضابطۂ شرعی کے مطابق تقسیم کی جاتی ہیں اور نہ ان میں سے حقداروں کو حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مجبوراً میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے والدین سے مال لیتا ہوں اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ نیز یہ کہ آئندہ جو میراث مجھے ان سے پہنچتی ہو وہ مجھے لینی چاہیے یا نہیں؟

جواب:۔ اگر آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں اور اپنی روزی خود کما سکتے ہوں تو ایسا ہی کیجئے ورنہ جب تک آپ مجبور ہیں کراہت کے ساتھ گھر والوں سے خرچ لیتے رہیے۔ زمانۂ جاہلیت کی جائدادیں جو غیر اسلامی نظام معاشی میں پیدا ہوئی ہوں۔ ساری کی ساری اصولاً غلط یا کم از کم مشتبہ ہوتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جب ایسی جائدادیں انھیں آبا و اجداد کے ترکہ میں ملیں یا کسی اور جائز صورت سے حاصل ہوں تو وہ انھیں تلف کر دیں یا ان سے دست بردار ہو جائیں۔ بلکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب یہ تمہارے قبضہ میں آئیں تو اس وقت سے ان کے اندر تم جائز شرعی طریقوں سے تصرف شروع کر دو۔ رہے سابق کے اہل حقوق جن کے حقوق غصب کیے گئے ہوں تو اگر وہ موجود ہوں اور ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو ان کے حق انھیں ادا کر دیے جائیں۔ ورنہ ایسے اموال کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوئے آئندہ جن جن لوگوں کے حق ان اموال میں پیدا ہوں، وہ ادا کیے جاتے ہیں۔

ملک کے نظم و امن کی پاسداری

سوال:۔ کیا بغیر لائسنس کے یا مقررہ موسموں اور اوقات کے علاوہ شکار کرنے اور اسی طرح بغیر لیمپ کے راتوں کو موٹر یا بائیسکل چلانا جو موجودہ قانون کے خلاف ہے، درست ہوگا؟

جواب:۔ موجودہ حکومت نے انتظام ملکی کو برقرار رکھنے کے لیے جو ضابطے بنائے ہیں اور جو بہر حال ایک منظم سوسائٹی کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہیں انھیں خواہ مخواہ توڑنا نہیں چاہیے۔ ویسے بھی قانون شکنی ہم صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ہم ایسی پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ نظم (آرڈر) کو توڑ کر جلدی سے جلدی کوئی دوسرا نظم قائم کر سکیں۔ ورنہ قانون شکنی کرنے کے معنی بدنظمی (   ) پیدا کرنے کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے اور جس میں ہمیں اللہ کی تائید حاصل ہونے کی توقع نہیں ہے۔

سود اور دار الحرب کی بحث

سوال:۔ ترجمان القرآن جلد ۴۲ عدد ۵ صفحہ ۲۹۰ پر تفہیم القرآن کے سلسلہ میں حرمت سود کی آیت کے ایک ٹکڑے "فلہ ما سلف" پر

حاشیہ لکھتے ہوئے جناب نے جو استدلال فرمایا ہے اس پر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ "وہ شخص جو پہلے کے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھاتا رہا ہے تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے"۔

سوال یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے پر صحابہ کرامؓ نے کیا عمل فرمایا؟ اگر انھوں نے اخلاقی حیثیت کی بنا پر مستحقین کو مال واپس کیا ہے تو آپ کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے، نیز اگر صحابہؓ کا عمل ایسا ثابت ہے تو آپ کو تفہیم القرآن میں اس کا اضافہ کر دینا چاہیے۔

ہندوستان کے دار الحرب ہونے پر بھی جواب میں کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ اس معاملہ میں قرآن کے الفاظ پر شاید آپ نے توجہ نہیں کی "فَلَهُ مَا سَلَفَ" کہنے کے بعد "وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ" جو فرمایا گیا ہے اس کا آخر کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اس کے معنی یہی تو ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ پہلے کسی نے سود کھایا ہے یہاں اس کی معافی کا اعلان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقدمہ کو زیر تجویز رکھا گیا ہے۔ اگر وہ اپنی سود سے جمع کی ہوئی دولت کو اپنے لیے عیش و راحت اور شان و شوکت کا ذریعہ بنائے تو اس کی حیثیت ایسے شخص کی سی ہوگی جو اپنے پچھلے گناہوں پر کوئی ندامت نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس شخص سے مختلف ہوگا جو اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو اور اپنے ظلم و جور سے کمائی ہوئی دولت کو اپنے عیش پر خرچ کرنے کے بجائے خلق اللہ کی خدمت پر صرف کرے، تاکہ اس کے اس جرم کی کسی حد تک تلافی ہو جائے جو وہ حالت جاہلیت میں کرتا رہا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق اگر کوئی نظائر ہمیں تاریخ میں نہ بھی ملیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکم کے منشا کی طرف جو صریح اشارہ قرآن شریف کر رہا ہے اس سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔

سوال کے دوسرے جز کے جواب میں یہ امر ملحوظ رکھیے کہ ہندوستان نہ دار الاسلام ہے نہ دار الحرب، بلکہ یہ دار الکفر ہے۔ دار الحرب اس معنی میں اس کو کہہ سکتے ہیں کہ یہاں "حرب" ہونی چاہیے، نہ کہ اس معنی میں کہ یہاں حرب ہو رہی ہے۔

سوال:۔ سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے اور دار الحرب میں سودی قرضہ لینا جائز ہے۔ خصوصاً اہم سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے جہالت کی وجہ سے سودی قرضہ لیا اور اب ان پر ایک گراں رقم اصل کے علاوہ سود کی ہو چکی ہے، کیا اس نظام حکومت میں رہتے ہوئے وہ سود ادا کرنے کی اجازت رکھتے ہیں؟ نیز ناگزیر حالات میں سودی قرضہ لینا کیسا ہے؟

جواب:۔ ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الکفر ہے۔ ایسے لوگوں سے جو ہندوستان کو دار الحرب کہہ کر سودی کاروبار کو جائز بتاتے ہیں، یہ پوچھیے کہ آیا یہ صرف سود کے لین دین ہی کے لیے دار الحرب ہے یا دوسرے معاملات کے لیے بھی؟

شریعت تو سود لینے اور دینے کو یکساں حرام قرار دیتی ہے اور حرام ہر حال حرام ہی ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف کام کرتے ہیں انھیں آخر یہ فکر کیوں ہے کہ وہ شریعت سے اجازت لے کر اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں؟

ناگزیر حالات میں جو شخص سودی قرض لینے پر مجبور ہو وہ مضطر کے حکم میں ہے مگر اس صورت میں پوری قوم گناہ گار ہوتی ہے کہ اس نے کوئی ایسا مالی نظم قائم نہیں کیا جس سے افراد کی ضرورتیں پوری ہو سکیں اور انھیں حرام میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔

غیر حکیمانہ تبلیغ سے اجتناب کی ضرورت

سوال:۔ ایک شخص کو ایک مدرسہ میں تبلیغ کے لیے ملازم رکھا گیا ہے۔ اب مدرسہ کے منتظمین خود ہی اس کی تبلیغی مساعی کو روکنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بعض آیات بچوں کو یاد کرانے میں وہ مانع ہوتے ہیں۔ ایسی چند آیات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ — اے ایمان لانے والو! یہود و نصاریٰ کو ولی دوست نہ بناؤ۔

۲- قاتلوا فی سبیل اللہ — جنگ کرو خدا کی راہ میں۔

۳- ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٓئک ھم الفٰسقون..... ھم الظٰلمون..... ھم الکٰفرون۔ — جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں دیتے وہ فاسق ہیں..... ظالم ہیں..... کافر ہیں۔

اب ایسے شخص کے متعلق شریعت کیا حکم دیتی ہے؟ اسے مدرسہ میں رہنا چاہیے یا علیحدگی اختیار کرنا چاہیے؟

جواب:- آپ جس طرح سوال کر رہے ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ صورت واقعہ اس سے مختلف ہے اور آپ اسے معصوم شکل دے کر استفتاء کر رہے ہیں۔

تبلیغ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موقع و محل کو دیکھے بغیر آدمی شدت کے ساتھ وہ باتیں کہنی شروع کر دے جن کا تحمل ابتدائی مرحلوں میں بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ جہاں لوگ توحید و رسالت اور آخرت کے ابتدائی تصور تک سے بیگانہ ہو کر رہ گئے ہوں وہاں یکایک ان چیزوں کا نہ صرف پورا تصور بلکہ اس کے انتہائی مقتضیات پیش کر دینا اور اس پر اتنا اصرار کرنا کہ لوگوں میں چڑ پیدا ہو جائے، تبلیغ کی حکمت کے خلاف ہے۔

اگر آپ کو یا آپ کے زیر اثر کسی شخص کو کسی وکیل یا جج کے ہاں بچوں کو پڑھانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے اس کے بچوں کو چن چن کر وہی چند آیتیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے یاد کرا کر اسے مجبور کیا ہے کہ وہ قرآن کے مقابلہ میں اکڑ کھڑا ہو یا پھر اپنے بچوں کی نگاہ میں کافر قرار پائے اس طریق کے بجائے اگر آپ بتدریج ان بچوں کو اسلامی عقائد کے مبادی سے، پھر ان کی تفصیلات سے، پھر ان کے انتہائی مقتضیات سے آگاہ کرتے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید میں ان چیزوں کی تشریح کرتے جاتے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کب آپ نے ان بچوں کے ذہن کو تبدیل کر دیا اور بغیر کسی مزاحمت کے آپ ان بچوں کو مکمل طور پر اس طرح تبدیل کر دیتے کہ پھر ان کے والدین کے بس میں یہ نہ رہتا کہ ان کے ذہن سے ان عقائد کو نکال سکیں۔ مگر آپ نے قبل از وقت ان کو نوٹس دے کر گویا یہ موقع دے دیا کہ وہ اپنے بچوں کو آپ کے اثر سے نکال لیں اور انھیں کسی ایسے استاد کے حوالے کر دیں جو یا تو انھیں بے دین بنا دے یا مذہب کا وہ تصور ان کے ذہن میں بٹھا دے جس کی رو سے "خدا اور قیصر" دونوں کے حقوق بیک وقت بے کھٹکے برابر ادا کیے جا سکتے ہیں۔

عید میلاد کے جلسے

سوال:- ہمارے ہاں عید میلاد کی تقریب پر جلسہ ہو رہا ہے۔ کیا اس میں شریک ہونا جماعت اسلامی کے نصب العین میں شامل ہے؟ اگر ہے تو میں شرکت کروں ورنہ نہ کروں۔

جواب:- میرے نزدیک میلاد یا سیرت کے یہ جلسے جو ربیع الاول کے موسم میں ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ان تفریحی مشاغل میں شامل ہو گئے ہیں جن سے مقصود بجز اپنے نفس کو یہ فریب دینے کے اور کچھ نہیں ہے کہ خدا اور رسول کا جو حق ہے وہ اسے بس اس طرح ادا کیے دے رہے ہیں اور ایسی ہی کچھ ذہنیت ان کے دوسرے مذہبی جلسوں کی بھی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لیے میں اس قسم کے جلسوں میں شرکت کو نہ صرف یہ کہ غیر مفید سمجھتا ہوں بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم مسلمانوں کی اس پرانی بیماری کو قوت پہنچانے کے مجرم نہ ہو جائیں۔ ہمارے پیش نظر جو اصلاحی کام ہے اس کے لیے ہم نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر ایک پروگرام تجویز کر لیا ہے اور اس پروگرام سے تمام قومی اور مذہبی جلسوں کی شرکت خارج ہے۔

ہم عوام کو خطاب ضرور کرنا چاہتے ہیں اور ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ دینی اصلاح کی آواز خدا کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک پہنچے

مگر اس کے لیے ہم وقت کی چلتی ہوئی بیماریوں سے الگ رہ کر دوسرے طریقے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

سوال :۔ ہمارے ہاں ہر سال ربیع الاول میں یکم سے بارہویں تاریخ تک مسجد میں درود و صلوٰۃ کی تسبیح ہوتی ہے اور بارہویں تاریخ کو عید میلاد کے سلسلے میں جلوس نکالے جاتے ہیں اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن کی صدارت عموماً کسی بڑے بندو کو دی جاتی ہے۔ جلسوں میں آنحضور کی سیرت و سوانح پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس تقریب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب :۔ اس پورے ہنگامہ میں اگر کوئی چیز قابل برداشت ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آنحضور کی سیرت کے متعلق عوام کو کچھ معلومات فراہم کر دی جاتی ہیں، مگر یہ چیز بھی قابل برداشت کی حد سے آگے نہیں جا سکتی کیونکہ یہ تبلیغی خدمت جس فضول نمائش اور رسمی ماحول میں جن غیر شرعی حرکات کے ساتھ انجام دی جاتی ہے، وہ اسے نتیجہ کے لحاظ سے بالکل بے معنی بنا دیتی ہیں۔ مزید براں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کو بیان کرنے کے لیے وہ طریقے اختیار کرنا جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پسند اور آپ کی تعلیم کے خلاف ہوں، ایک ایسی ستم ظریفی بلکہ بدتمیزی ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ جس ذات پاک کا ذکر جھوم جھوم کر کرتے ہیں اس کے طریقہ سے زیادہ غیر محبوب طریقہ ان کے نزدیک کوئی نہیں ہے اور انھیں خاص اس کے ذکر کی مجلس میں بھی اس کے طریقہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

عذرِ مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی بندگی

سوال :۔ ایک شخص غیر اللہ مثلاً بادشاہ یا حکومت باطلہ کی اطاعت کرتا ہے اور اعتقاداً بھی اسی کو حق سمجھتا ہے۔ اور اس فعل پر مجبوری کا عذر پیش کرتا ہے۔ دوسرا شخص ہے کہ اعتقاداً تو اس کی بندگی نہیں کرتا لیکن عملاً اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے لیے مجبوری کا عذر پیش کرتا ہے۔ کیا ان دونوں کے عمل میں کوئی تفریق کی جا سکتی ہے؟

آپ کی تفسیر الٰہ و رب کے لحاظ سے تو دونوں ایک ہی درجے میں ہوئے، حالانکہ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

جواب :۔ میں اپنے مضامین میں کئی جگہ اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ تمام انسان حسب ذیل چار طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

ا۔ مومن بالغیر و مسلم للغیر۔ یعنی جو غیر اللہ کو مطاع برحق اور ماخذ امر اعتقاداً بھی مانتے ہیں اور عملاً اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ یہ مکمل کافر ہیں۔

ب۔ مومن بالغیر و مسلم للہ۔ یہ پوزیشن ذمیوں کی اور ایک حد تک منافقوں کی ہے۔

ج۔ مومن باللہ و مسلم للغیر۔ یعنی اللہ کو اعتقاداً مطاع برحق ماننے والے مگر عملاً غیر اللہ کی اطاعت و بندگی بجا لانے والے۔ یہ پوزیشن ان لوگوں کی ہے جن کا مسئلہ آپ نے دریافت کیا ہے۔ اس حالت میں اگر مسلمان مبتلا ہو جائے تو اسے اس پر راضی ہونا چاہیے نہ مطمئن رہنا چاہیے بلکہ اس کا فرض ہے کہ یا تو اس حالت کو بدلنے کی کوشش کرے یا اس سے نکل جائے۔

د۔ مومن باللہ و مسلم للہ۔ یہی اصلی مسلمانوں کی پوزیشن ہے اور قرآن کی دعوت تمام انسانوں کو یہی ہے کہ وہ یہی پوزیشن اختیار کرنے کی سعی کریں۔ اس پوزیشن میں کوئی رخنہ اس وجہ سے واقع نہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی غیر مسلم نظام میں مجبوراً اپنی کسی کوتاہی سے نہیں بلکہ حالات کے جبر سے گرفتار ہو جائے جس طرح کہ مکہ میں مسلمان تھے یا جس طرح بہت سے صحابہ کرام کفار کے ہاتھوں اسیر ہوئے یا جیسا کہ اکثر انبیاء کا حال رہا ہے جو نظام کفر ہی میں پیدا ہوئے۔ اس طرح کی مجبوری گرفتاری اسلام للہ کی تعریف میں نہیں آتی کیونکہ اول تو یہ چیز ان کی اختیار کردہ یا قبول کردہ نہ تھی بلکہ ان پر مسلط شدہ تھی۔ دوسرے جب کوئی شخص مومن باللہ و کافر بالغیر ہو چکا ہو اور اس کے ساتھ جس نے اپنی حد تک مسلم للہ ہونے اور عاصی للغیر ہونے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو اس پر مسلم للغیر ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

ہاں یہ بات یقینی ہے کہ طبقہ ج کی پوزیشن طبقہ ۱ و ب سے بالکل مختلف ہے۔ مومن باللہ و مسلم للغیر مشرک اور کافر ہرگز نہیں ہیں لیکن اگر وہ اس حالت پر راضی ہیں یا اسے بدلنے اور اس سے نکلنے کی امکانی سعی نہیں کرتے تو سخت گناہ گار ہیں، ایسے گناہ گار کہ ان کی ساری زندگی گناہ بن کر رہ جاتی ہے۔

مطبوعات

تفسیر سورہ قیامہ تالیف حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ۔ مترجم: امین احسن اصلاحی۔ چھوٹی تقطیع۔ ۸۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی غنیمت، کاغذ دبیز۔ ملنے کا پتہ: دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ۔ قیمت: ۸/

حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیر قرآن میں ایک خاص اسلوب ہے، جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ قرآن کریم پر روایات اور اسرائیلیات سے الگ ہو کر غور کرتے ہیں، جس میں نظم کلام پر خاص توجہ رہتی ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کلام نظم و ترتیب سے خالی نہیں ہو سکتا آیات کی تاویل اور الفاظ کی تشریح میں ان کا اعتماد خود قرآن کریم اور اس کے بعد کلام عرب پر ہے۔ کلام عرب اور خاص کر کلام جاہلیت پر ان کی نگاہ اتنی دقیق اور وسیع ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شاید ہی عربی کا کوئی اچھا شعر ہو، جو ان کے پیش نظر نہ ہو۔

سورہ قیامہ کی تفسیر بھی ان کی تفسیری خصائص کی حامل ہے۔ پہلے سورہ کا عمود (یعنی مرکزی مضمون) سابق سورہ سے تعلق اور اس کے بعد اسلوب بیان اور دوسری خصوصیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس تفسیری جزو کے متعلق مختصر طور پر اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ مولانا فراہیؒ کی تالیف اور ان کی تفسیری خصوصیات کا جامع ہے۔ مولاناؒ کی اصل تالیف تو عربی میں ہے۔ ترجمہ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے ہے۔ ہم نے جا بجا اصل سے مقابلہ کر کے دیکھا اور بے ساختہ ترجمہ کی سلاست اور روانی کی داد دینے پر مجبور ہوئے۔ جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں، ان کے لیے یہ ایک نایاب تحفہ ہے۔ اور عربی جاننے والے بھی اس لحاظ سے مستفید ہو سکتے ہیں کہ عربی عبارتیں سلیس و فصیح اردو میں کس طرح منتقل کی جاتی ہیں۔

The Holy Qur'an ترجمہ مولانا عبد الماجد دریابادی۔ جزو اول۔ ۲۰ صفحے۔ کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔ قیمت ۶/

قرآن مجید کے متعدد ترجمے انگریزی زبان میں ہو چکے ہیں۔ جن میں مرحوم محمد مارماڈیوک پکتھال، عبداللہ یوسف علی اور محمد علی لاہوری کے ترجمے زیادہ مشہور ہیں۔ محمد علی صاحب لاہوری کا ترجمہ و حاشیہ معنوی تحریفات سے بھرا ہوا ہے اور زبان بھی پھیکی اور بے مزہ ہے۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے ترجمہ کی بجائے تشریح کو پسند کیا ہے، مگر توضیحی حواشی کی کمی کے باعث اس کی افادیت کم ہو گئی ہے۔ عبداللہ یوسف علی کے ترجمے میں زبان کا چٹخارہ بھی ہے اور توضیحی حواشی بھی ہیں مگر ان کا دینی علم اتنا محدود اور ناقص ہے کہ اتنے بڑے کام کی ذمہ داری کے وہ اہل نہیں کہے جا سکتے۔ بہرحال اس میں اتنی خوبی ضرور ہے کہ دہ ارادی تحریفات سے خالی ہے۔

موجودہ ترجموں کی ان کوتاہیوں کے پیش نظر قرآن کریم کے ایک ایسے انگریزی ترجمہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی تھی، جو ان خامیوں سے پاک ہو اور جسے پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ نوجوانوں کے ہاتھ میں دیا جا سکے۔ مولانا عبد الماجد کا ترجمہ اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتا ہے۔ مولانا عبد الماجد ایک طرف تو راسخ العقیدہ عالم اور ٹھیٹھ مسلمان ہیں اور دوسری طرف یورپ کی نت نئی گمراہیوں اور فکری بھونچال پر خاص نظر رکھتے ہیں نیز ترجمہ و تالیف کی مختلف منزلوں میں وہ وقت کے مستند عالموں سے برابر مشورہ بھی لیتے رہے ہیں۔ اس لیے یہ توقع کرنا بعید نہ ہوگا کہ ان کا ترجمہ نئی پود اور عام انگریزی دانوں کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہوگا۔

ترجمہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ عقائد کے باب میں ٹھیٹھ اسلامی روش اختیار کی گئی ہے۔ اور دانش فروشان عصر حاضر کی طرح خواہ مخواہ کی تاویل و تحریف سے اجتناب کیا گیا ہے۔ دوسری امتیازی چیز اس کے توضیحی حواشی ہیں، جو اکثر و بیشتر نہایت قیمتی اور مفید ہیں۔ بائبل اور یہودی

اور عیسائی اہل علم کی دوسری مستند کتابوں سے بکثرت شواہد جمع کیے گئے ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے کبھی جوئے شیر کے منہ سے نکلوانے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ متعدد جگہ غلطی اور صحیح ہے۔ جن عربی مفردات کے لفظی ترجمے تشفی بخش نہیں معلوم ہوئے، ان کی توضیح حاشیے میں کردی گئی ہے۔ اسی طرح حواشی گوناگوں لغوی، نحوی، تاریخی اور جغرافی معلومات اور فوائد کا مجموعہ ہیں۔ البتہ ترجمہ میں بائیبل کی زبان اور طرز ادا (Phraseology) اختیار کیا گیا ہے، جس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور اصحاب ذوق کی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک حرف عربی کلمات کے 'املا' (Transliteration) سے متعلق۔ مستشرقین کی کانفرنس (ریکسل: ۱۹۱۱ء) نے املا کے جو علامات مقرر کیے تھے۔ ان کی پابندی کی جاتی، تو اچھا تھا۔ خ، کا املا Kh کی بجائے Ḫ اور ش کا Ş ہونا چاہیے۔ ض، کا املا Dh بہت زیادہ اشتباہ کا باعث ہوگا۔ ض کا مستند املا 'D' ہی رکھا جاتا، تو اچھا تھا۔ اسی طرح 'غ' کے لیے 'gh' کے بدلے 'ġ' ہی بہتر اور انسب ہے۔ گو مولانا نے دیباچے سے پہلے اپنے طرز املا (Transliteration) کی تشریح کر دی ہے۔ مگر بار بار ورق الٹ کر اشتباہ اور الجھن کا دور کرنا بھی آسان نہیں۔

بہرحال یہ معمولی فروگذاشت ہے اور ایسی جس میں اختلاف رائے کی ابھی خاصی گنجائش ہے۔ یوں ترجمہ بحیثیت مجموعی وقت کی ایک اہم ضرورت پورا کرتا ہے۔ ابھی صرف پہلا پارہ چھپا ہے، اللہ کرے کہ یہ پورا سلسلہ جلد از جلد شائع ہو جائے۔ اور انگریزی جاننے والے مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

المختصر مرتبہ مولوی احمد اللہ صاحب، سواہی گوڑہ، حیدر آباد دکن۔ تقطیع چھوٹی، ۲۰ صفحے، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ دیسی حیدر آبادی عمدہ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً خود مرتب سے مل سکے۔

امام ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی (ف ۲۰۴ھ) کی فقہ پر نہایت مختصر، مفید اور جامع رسالہ ہے۔ یہ اصل میں قاضی ابو شجاع احمد بن حسین اصفہانی (ف ۵۹۳ھ)، کے رسالہ التقریب پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے التقریب کی بعض شرحوں اور حاشیوں سے بھی مدد لی ہے۔ ہم نے جا بجا سے رسالے کو دیکھا، طرز ادا صاف، سلیس اور شگفتہ پایا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ فقہ شافعی کے مبتدیوں اور طالب علموں کے لیے یہ رسالہ کافی و شافی ہوگا۔

قصص و مسائل مولانا عبدالماجد دریابادی، چھوٹی تقطیع، ۱۳۲ صفحے، کاغذ، لکھائی چھپائی عمدہ، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن۔ قیمت ۱۲؎

یہ کتاب مولانا عبدالماجد دریابادی کے دو مقالوں، بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں، اور جدید قصص الانبیاء کا مجموعہ ہے۔ پہلا مقالہ رضا اکاڈمی رامپور میں سنایا گیا تھا (۱۹۳۸ء) اور دوسرا اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھا گیا تھا (۱۹۳۷ء)۔ دونوں قرآن کریم سے متعلق ہیں اور ان میں خاص طور پر قرآن مجید کے علمی، اثری، جغرافی اور تاریخی پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔ طریق بحث عالمانہ اور محققانہ اور انداز بیان ادیبانہ اور دل آویز ہے۔

مولانا عبدالماجد عرصہ دراز سے قرآن کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ترجمہ قرآن (انگریزی) کے حواشی اور ان مضمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں یورپ کے مذہبی اور اثری و جغرافی لٹریچر کو خوب کھنگالا ہے۔ جہاں تک عام خادمان قرآن کی رسائی نہیں ہوتی۔ کسی مصنف اور صاحب تحقیق کی عام تحقیقات و نتائج سے پورا پورا اتفاق کرنا تو بہت دشوار ہے۔ اتنا بہرحال اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی مولانا کی فراہم کردہ معلومات نہایت قیمتی اور مفید ہیں۔ انداز بیان کا البیلا پن اور اس پر اردو کی نکھری ستھری زبان سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ مولانا دریابادی کی انشا خاص کی چیز ہے۔

شروع میں مصنف کا مختصر دیباچہ ہے اور اس کے بعد غالباً جناب ناشر نے کچھ "ناظرین" سے کہنا چاہا ہے۔ ایسی ستھری کتاب میں یہ دخل در معقولات ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ ہمیں تو ناشر کی دلچسپی "مشناس" "تقسیم" کی معلوم ہوتی ہے لیکن ناشر صاحبان کو اس قسم کی "تصنیف فرمائی" سے روک کون سکتا ہے؟ (م-ع)

خـــالی صفحـــه

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے' اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ' طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان — جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مددگار ثابت ہوگی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جلد شائع ہو رہی ہے

ملنے کا پتہ:

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور۔ پاکستان

سرورق ربن پریس لاہور میں چھپا